باب اول

(اِبتدایہ)

--- رشد و ہدایت کے تین مراکز

ہرکسی از ظنِ خود شد یارِ من --- ما ز درونِ من نجست اِسرارِمن (رومیؒ)

(ترجمہ: ہر کوئی میرا شناسا بن گیا ۔ پر نہ سمجھا ۔ ہیں میرے اِسرار کیا؟)

۱۹٦۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیٰ میں پشاور یونیورسٹی کے کیمپس پر طلباء اور اسا تذہ کی روحانی فیض و تربیت کے لیٔے مندرجہ ذ یل تین مراکزقائِم تھے۔

۔ لالا عبدالرحیم نیازی کا مکتبِ فکر و نظر

۔ عُبیداللہ دُرانی کا مطب اور درگاہ

۔ مولانا محمد اشرف سلیمانی کا تبلیغی مِشن

سابقہ وائِس چانسلر چوہد ری محمد علی صاحب کو ایک مجلسِ مذاکرہ میں ایک بار اس حقیقت کا فخریہ اعتراف کرنا پڑا کہ پشاور یونیورسٹی میں مذہبی اور روحانی ماحول چھا رہا ہے۔ جبکہ اِس سے قبل یہ کہاوت مشہور تھی کہ اسلامیہ کالج شرابی کبابی کالج ہے جبکہ ایڈورڈ ز کالج گڈ مڈ کالج ہے۔ اسلامیہ کالج میں طلبأء کا یونیفارم کالی شیروانی اور سفید شلوار تھی۔ اِس لیٔے انہیں کالے کوّے کہا جاتا تھا جبکہ ایڈورڈ کالج والے سبز بلیزر کیساتھ گرے پتلون پہننے کی وجہ سے سبز چوچے کہلاتے تھے۔ اُس وقت تک سر زمینِ پشاور میں یہی دو کالج مشہور تھے۔ اِن کالے کوؤں اور سبز طوطوں کے جُھنڈ آخر پشاور یونیورسٹی میں آملتے۔

اِن طلبأء کی دینی معلومات کا یہ حال تھا کہ بقولِ اسلامیہ کالج کے شعبہ اسلامیات کے صدرنشین محترم قاضی نورالحق ندوی المعروف ڈین صاحب کے ' چارسدہ کے ایک طالبِ علم نے اپنے پرچہ اسلامیات(اختیاری) میں اِس سوال کہ " اِسلام کے پانچ بنیادی ارکانِ دین کونسے ہیں؟" کے جواب میں لکھا تھا: (۱) سر سید احمد خان (۲) مولانا محمد علی جوہر۔ (۳) علامہ اِقبال۔ (۴) قایٔدِاعظم ۔ (۵) لیاقت علی خان ۔ اِ سی طرح اسلامیہ کالج کی تاریخی مسجد جِس کی بنیاد مجاہد ملت حاجی صاحب تُرنگزیٔ (رح) نے رکھی تھی۔ وہاں ڈین صاحب ڈِکٹیٹر بن کر کسی اور واعظ یا مصلح کو تقریر کرنے یا اپنا پروگرام پیش نہ کرنے دیتے۔ صرف جمعہ کے روز نماز سے قبل خود ایک خُطبہ ضرور اِرشاد

فرماتے۔ جِس میں دینی۔ مذہبی اور روحانی مسائِل پیش کرنے سے زیادہ لطیفے اور چُٹکلے اور طنزیہ بول ہوتے۔ البتہ حضور صلی'اللہ علیہ وسلم اور اِسلام کا معا شرتی نظامِ زندگی وہ بڑے مؤثر اور جذباتی انداز میں پیش کرتے تھے۔ لیکن ان کے اس والہانہ اندازِ بیان پر بھی شعبہ تاریخ کے انچارچ ڈاکٹر منور خان کو بہر حال یہ اعتراض تھا کہ " ڈین صاحب اپنے بیان میں حضور صلی' اللہ علیہ وسلم کا اِسمِ گرامی یوں لیتے ہیں' جیسے آپﷺ ان کے ہم جماعت رہے ہوں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذِکر یوں فرماتے جیسے یہ مقدس ہستیاں بچپن میں ان کے ساتھ گلی میں کھیل چُکی ہوں۔ (نعوذ باللہ۔ خاکم بدہن)۔ اصل حقیقت یہ تھی ۔ کہ ڈ ین صا حب کی عادت تھی کہ وہ اپنے وعظ میں پہلے اپنا رواں فقرہ مکمل کرنے کے بعد حضور نبی کریمﷺ پر درود و سلام بھیجتے۔ مثلا" وہ کسی بھی روایت کا آغاز یوں کرتے۔ محمد(ص) ایک بار اپنے دو یاروں ابوبکر(رض) اور عمر(رض) کے ساتھ کہیں جارہے تھے۔ بعد از تکمیلِ فقرہ کچھ وقفے کے بعد کہتے "صلی' اللہ علیہ وسلم۔ ڈاکٹر منور خان ایسے بے باکانہ بیانات پر سخت معترض تھے۔ اور ان کو شانِ نبیﷺ اور اصحابِ رسول(رض) کی شان میں گستاخی اور بے ادبی پر معمول سمجھتے ۔ میری اِس لمبی تمہید کا مطلب صرف یہ بتلانا ہے کہ ان سالوں میں کالج اور یونیورسٹی کی علمی فِضا پر نسبتا" دینی کم علمی اور روحانی اِفلاس کی ایک تاریکی چھائ ہوئ تھی۔ وائِس چانسلر چوہدری محمد علی صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے جہاں علمی شعبوں کو ایک نئ جہت ملی' وہاں ذکر و ہدایت کے تین ذِکر کردہ فانوس روشن ہوگئے ۔ اور طلباً ء و اساتذہ کی ایک نیک و صالح ۔ بابندِ شریعت نسل وجود میں آتی گئ۔ ہم اِس مضمون میں اِن متنوع الفکر بزرگ شخصیات کی تعلیمات ۔ تصنیفات اور طریقہ ہائے دعوت و تبلیغ ۔ تربیتِ ذکر و فکر اورحاصل نتائج پر مختصرا" روشنی ڈالیں گے -----------------------------

''

باب دوم

خاموش مبلغ (لالا عبد الرحیم نیازی قدس سرۃ)

هر کی جشمی شیرین باشد - مردُ م و مُرغ ومُور گرد آیند

ترجمہ: جہاں کہیں بھی میٹھا چشمہ ہوگا۔ انسان۔ پرندے اور چیونٹیاں اِس پر جمع ہونگیں ۔

اعزازی پروفیسر

لالا عبد الرحیم ایسی ہی ایک خدا رسیدہ بُزرگ تھے۔ جنہوں نے بغیر کسی لالچ۔ طمع یا دُنیاوی غرض کے مخلوقِ خُدا کی روحانی رہنمائ کیلئیے پشاور یونیورسٹی کے علمی مگر رنگین ماحول میں علم و معرفت کا ایک دبستان قائم کردیا تھا۔ اور یہی ان کے قابلِ فخر شاگرد چوہدری محمد علی وائس چانسلر کی شدید خواہش تھی' جو اُن کے ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالج کے قیام کے وقت' اولین شاگردوں میں سے تھے۔ چوہدری صاحب نے اُنہیں پشاور یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر بننے پر راضی کرکے کیمپس پر مستقلا" آباد کرنے کا انتظام کیا۔ اور پھر وہ کئ سال تک نئ نسل کی روحانی تربیت فرماتے رہے۔ -

سب کا میکدہ

ایک ایسا میکدہ جہاں پر رِند کو بقدرِ ظرف اِذنِ جام تھا۔ زاہد۔ عابد۔ گنہگار۔ پارسا ۔ عالم و جاہل۔ اُستاد۔ طالبِ علم ۔ امیر اور فقیر ہر کسی کو اپنی صلاحیت اور فطری استعداد کے مطابق حصہ پہنچتا۔ ایک عجیب سی محفل گرم ہوتی۔ ایک جانب تذبذب میں مبتلا فلاسفر تشریف فرما ہوتے۔ تو دوسری طرف اپنی بھاری بھر کم کمبلوں میں لپٹے مال و دولت کے نشے میں مست دُ نیا دار صوفوں پر ٹیک لگاۓ ہوتے۔ غم ہاۓ دُنیا سے بے نیاز نوجوان طالب علموں نے ایک الگ لا اُبالی دنیا بسائ ہوتی ۔ لحظہ بعد دروازے سے ایک بوسیدہ پھٹی خِرقہ میں ملبوس ملنگ "اللہ ھو" کے نعرے مارتا ہوا اندر شریک محفل ہو جاتا ۔ متنوع عجیب و غریب موضوعات پر زور و شور سے بحث لگی رہتی۔ درمیان میں ایک صوفے پر براجمان ایک نورانی بشر ہوتا ۔ جو بظاہر اِس ساری مغزخوری کی فضا سے لا تعلق آنکھیں بند کیٔے نظر آتے۔ یہ بُزرگ شخصیت بڑے مزے سے گاہے بگاہے حُقے کے کَش لیتے اور تب دُھوئیں کے مرغولے بلند ہوتے دِکھائ دیتے ۔ وِنسٹن چرچل کا پائپ ۔ گاندھی جی کی بکری اور

لالا صاحب کا حُقہ ایک دوسرے کیساتھ لازم و ملزوم تھے۔ چہرے پر ایک سُفید خشخشی ریش سجائے ہوتے جیسے مرزا اسد اللہ غالب کی آخری عُمر کی تصویرہو۔

لالا عبالرحیم ایک خاموش مبلغ اور بڑے مہمان نواز مُرشد تھے۔ ذکرِقلبی اور مخفی میں مصروف رہتے ۔ عشاء سے پہلے محفل برخواست ہوجاتی۔ اورحضرت کسی فارسی یا انگریزی شاعر کی صوفیانہ رُباعی یا "سٹینزہ" دہراتے ہوئے اپنے خلوت خانے میں ذکر وفکر اور عبادت و ریاضت کے بعد کچھ ساعت استراحت فرماتے۔ جب کوئ مسٔلہ منطقی دلائِل ۔ جذباتی باتوں۔ فلسفیانہ استدلال اور تاریخی مثالوں سے حل نہ ہونے پاتا۔ ہر ذہن تھک جاتا اور ہر عقل حیران ہوجاتی۔ تو درمیان میں تشریف فرما خاموش مُبلغ اپنی آنکھیں وا کردیتے۔ اور آہستہ سے تاثیر بھری مُبہم سی بات کہہ جاتے۔ کوئ تو اِس اِشارے کو سمجھ لیتا اور کئ دیگر ایسے ہی سر ہلا دیتے۔ بات کیا ہوتی۔ ایک الہامی آوازہوتی ۔ حال و قال سے نکلا ہوا ایک راز۔ ہر ذہن کی تسلی ہوجاتی۔ ہر بیقرار آسودگی پاجاتا۔ کسی اور کیلئِے مزید کچھ کہنے کی گنجائِش باقی نہ رہ پاتی ۔ ہر بندہ اپنی جگہ پر مطمئِن اور حقیقت آشنا ہوجاتا۔ یہ تھا لالا صاحب کا ناقصوں اور علمی تشنگی بجھانے والوں کو فیض پہنچانے کا منفرد اور نادر طریقہ۔

مجھے وہ دِن خوب یاد ہے جب حاضرین مجلس زمان و مکان کے فلسفے پر بحث میں مصروف تھے۔ پروفیسرمعراج مصطفے' برگسان۔ ڈیکارٹ اور آینسٹا ین کے نظریات کے حوالے پر حوالہ دئے جا رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ لیکچر دیتے رہے۔ لیکن حاضرینِ محفل کے شکوک و شبہات مزید بڑھ رہے تھے۔ مقررموصوف سے فلسفے کی پُر پیچ گلیوں میں حقیقت کی منزل گُم ہوچکی تھی، ان کے پاس "حکمتِ یونانیان" اور "حکمت فرنگیان" کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ لیکن یہ ایسا مسئِلہ نہ تھاکہ بغیر "حکمت ایمانیان" کی مد د سے حل ہوجاتا۔ لالا صاحب جو اس ساری بحث کے دوراں آنکھیں بند حالتِ استغراق میں ذکرِ قلبی و مخفی میں مصروف تھے' اچانک انہوں نے ایک مخصوص انداز میں آنکھیں وا کیں ۔ جواب مختصر تھا۔ لیکن کئ معانی اور مطالب سے بھر پور۔ فرمایا "تمہارا اِس فقیر کے متعلق کیا خیال ہے جو کہتا ہے کہ زمان و مکان دونوں میری جیب میں پڑے ہیں؟"۔

ایک روزآیک نوجوان نے ان سے پوچھا کہ آیا یہ صحیح ہے کہ عمر بڑھنے کیساتھ ساتھ انسان کی ذہنی قوت ترقی کرتی جاتی ہے اور عقل بڑھ جاتی ھے؟۔ لالا صاحب بولے کہ معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ بڑھاپے میں انسان کی زہنی استعداد۔ عقل اور دماغی قوت مضمحل ہوجاتی ہے۔ جبکہ جوانی میں ذ ہنی قوت بامِ عروج پر ہوتی ہے۔ لیکن جِنسی جِبلت اِسے کام نہیں کرنے دیتی۔ عمر کے بڑ ھنے کے ساتھ جب دیگر جسمانی قوتوں کے ہمراہ جنسی قوت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ تب یہ فرد بغیر کسی رکاوٹ کے اِس عالم حیرت مینں صحیح اور گہری سوچ کرنا شروع کردیتا ہے۔ یہ کہتے ہوئِے انہیں شاہد اپنی جوانی کا زمانہ یاد آگیا۔ تو اُردو کا یہ گیت اپنے ساتھ آہستہ آہستہ گُنگنانے لگے:

"اسیر پنجہ عہد شباب کرکے مجھے ۔ کہاں گیا میرا بچپنا خراب کرکے مجھے"

اگرچہ وہ فطرتا" خاموش طبع اور سنجیدہ شخصیت تھے۔ بہت کم بولتے اور وہ بھی چند ایک ذومعنی اور مختصر فقرے۔ اس کے باوجود موقع کی مناسبت سے ایک آدھ قصہ گذری جوانی کے دنوں کا

بھی نوجوان حاضرین کی خوش طبعی اور دلچسپی کیلٔے سُنا جاتے۔ شہر دِلی اور اس کے چاند نی چوک کا ذکر ہورہا تھا۔ لالا صاحب نے فرمایا کہ اِس چوک میں ایک روز ایک سبزی فروش تازہ تازہ ۔ نرم نرم اور پتلی پتلی بھنڈیاں ایک ریڑھی پر بیچ رہا تھا۔ ساتھ ہی تشبیہات اور اِستعاروں سے مُرصع اُردوۓ مُعلی' کی نزاکت اور نفاست کو ملحوظ رکھتے ہوۓ یہ اد بیانہ صدا گاہگوں کو دعوتِ نظارہ و خریدِ سودا دے رہا تھا۔ " لیلی' کی اُنگلیاں ہیں۔ مجنوں کی پسلیاں ہیں"۔

علامہ اقبال نے اعلی' حضرت نادر شاہ کی دعوت پر کابل جاتے وقت پشاور کے ڈاک بنگلے میں ایک رات قیام کیا تھا۔ لالا صاحب فرماتے تھے کہ وہ بھی اپنے چند پروفیسر ساتھیوں کے ہمراہ اُن سے ملنے گۓ تھے۔ ایسا معلوم ھوتا ہے کہ وہ علامہ مرحوم کی شخصیت اور فلسفے سے کچھ زیادہ مُتاثر نہیں ہوۓ۔ البتہ ٹیگور کی شخصیت اور فن کی مدح وہ اکثر بیان کرتے تھے۔ اِسی طرح گاندھی جی کے بارے میں وہ ایک خواب بیان کرتے (اپنا یا پرایا؟) کہ گاندھی جی اسلام کے کافی مداح تھے۔ لیکن جب مہاتما جی سے ِ اسلام قبول کرنے کی بات ہوئ تو اُن کا جواب تھا۔ "بڑا کھون (خون) ہوجاۓ گا"۔

اویسی طریق اور خلقِ خدا سے مُحبت:

لالا صاحب نے شیخ عبد القادر جیلانی (رح) سے اویسی طریقے پر فیض پایا تھا۔ وہ اکثر اِس کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ البتہ کسی زندہ شخصیت سے ان کے فیض لینے کا قصہ میں نے نہیں سُنا۔لا لا صاحب عالم با عمل تھے۔ عارف بے بدل تھے۔ زاہد شب زندہ دار تھے۔ فاضل اجل تھے۔ اُستاد کامل تھے۔ محرمِ رازِ ربانی تھے۔ لیکن مجھ جیسے بے بصیرت انسان کیلیۓ ان کی مندرجہ ذ یل خوبیاں باعث کشش تھیں۔

وہ اپنی ذات میں سراپا مہر ۔ محبت اور شفقت تھے۔ ہر شخص کی عقلی اِستعداد کے مطابق بات کرتے۔ مجھ جیسی کئ بے صلاحیت اور ناقص العقل افراد کے منہ سے نکلی بے تُکی باتوں پر بجاۓ سرزنش کے حوصلہ افزائ فرماتے۔ ایک دِن میں نے انکی اعلی' مجلس میں پشتو کا یہ ٹپہ پیش کیا:

ورځہ فلکَ لاس دے آزاد دے --- یار مے دے جدا کہ اوس دے څہ پروا لرم

ترجمہ:(جاؤ بے رحم فلک تیرے ہاتھ آزاد ہیں'

میرا یار بجھڑ گیا ہے' اب مجھے تیری کیا پروا ہے۔)

اُردو ترجمے کیلیۓ میں نے لالا صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرا دِ یے۔ اِ ن کی مسکراہٹ کے انداز سے ہی مجھے اپنے کہے ہوۓ شعر کی بے وزنی کا احساس ہوگیا۔ لیکن لالا صاحب نے فورا" فرمایا ۔ اچھا بھلا بنوچیوں کا "توس" (خالی خولی دھمکی) ہے۔ "توس" کے لفظ سے صحیح لطف صرف ایک اصل بنوں کا باسی اُٹھا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ لالا صاحب دورانِ ملازمت گورنمنٹ کالج بنوں کے پرنسپل بھی رہے تھے۔ شعر کی فرما ئش دوبارہ اور سہ بارہ فرمائ۔ صرف اِس ھیچمدانی کی حوصلہ افزائ کی خاطر۔

(۲) اِن کی دوسری بڑی خوبی اِن کی اِنتہائ سخاوت اور میزبانی تھی۔ پنشن۔ ہدیہاور نذرانے سب چھ وہ ضرورت مندوکں پر تقسیم کردیتے ۔ اور اپنے پاس کچھ بھی نہ چھوڑتے۔ اِن کی وفات پر منعقدہ تقریب میں قاضی نور الحق ندوی (ڈین صاحب) نے اپنی تقریر میں ایک واقعہ بیان کیا کہ میں اور لالا صاحب اسلامیہ کالج کیمپس پر ایک وقت میں پڑوسی تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ لالا صاحب اپنی ساری آمدن اللہ کے نام پر ضرورت مندوں میں تقسیم کردیتے تھے اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رہنے دیتے۔ ایک دِن میں نے بھائ بندھن کے ناطے اِن کو مشورہ دیا۔ کہ" لالا صاحب ! آپ آل اولاد والے ہیں اتنی سخاوت اچھی نہیں کہ کل آپکی اولاد تکلیف و تنگی میں مُبتلا ہو۔ اِس پر لالا صاحب بہت خفا ہوۓ۔ فرمایا "ڈین صاحب! آپ مجھے اس قسم کا مشورہ دے رہے ھیں۔ کیوں میرا پروردِگار غیرتی نہیں ھے۔ آج جب میں اُس کے نام پر غیرت کر رہا ہوں۔ کل وہ میری اولاد کے نام پر غیرت نہیں فرماۓ گا؟" ڈین صاحب نے کہا کہ اِس جواب مجھے بے حد شرمندہ اور لا جواب کردیا۔ اور آج ہر فرد پر یہ بات واضح ہے۔ کہ لالا صاحب کی اولاد کو ہر لحاظ سے دُنیاوی فراغت حاصل ہے"۔ اِس کے بعد ڈین صاحب نے دعا کیلیۓ ہاتھ اُٹھاۓ۔ اور بڑے سوز اور اشکبار آنکھوں سے لالا صاحب کے حق میں مالکِ حقیقیذار ہوۓ کے دربار میں درخواست ہوۓ۔ "بارِ اِلہی! عبدالرحیم نے ساری عمر تیرے نام پر غیرت کی۔ آج وہ تیری غیرت کا محتاج ھے"۔

لالا صاحب اسلامیھ کالج پشاور کے اولین اساتذہ مین سے تھے۔ کافی عرصہ فلسفے اور منطق کا درس دیتے رہے۔ لیکن صرف عقل کے بل بوتے ہر حقیقتِک کُل تک رسائیناممکن تھی۔ لیکچر کے دوران مالکِ حقیقی کی درگاہ میں سجدہ ریز ہوجاتے۔ اِس لیے اعلی' حکام نے ملازمت کے آخری حصے میں اُنہیں فارسی ادبیات کا اُستاد مقرر کیا۔ کیونکہ فلسفے کی تعلیم اُنکی فقیرانہ طبعی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے اِمام غزالی کی مانند وِجدان کو عقل پر ترجیع دی۔ کافی عرصے تک مجھے یہ پتہ نہ لگ سکا کہ لالا عبدالرحیم ابتک فلسفے کے مضمون سے کچھ شغف اور ربط رکھتے ہیں یا نہیں۔ تا وقت یہ کہ میں نے انجنیرنگ کالج کے سابقہ پرنسپل عُبیداللہ دُرانی کی لکھی ہوئ کتاب "وِدھر ای سادھو؟" نہ پڑھی اور اِس کتاب (سادھو کہاں جارہے ہو؟) پر اُن کا دیپاچہ میری نظر سے نہ گذرا۔ معلوم ہوا کہ لالا صاحب کی مسئلے تک رسائ اور نظریہ اب بھی منطقی اور فلسفیانہ تھی ۔

لالا صاحب کی فیوض و برکات سے کئ ممتاز افراد نے فا ئِدہ اُٹھایا۔ جو بعد میں حکومت کے اہم عہدوں پر فائِز رہے۔ نامور ناول نگار اور ادیب رسول رساؔ مرحوم اِن کے داماد تھے۔ لیکن اِتنا قریبی روحانی۔ نسبتی اور معنوی تعلق ۔ علمی استعداد اور اعلانات کے باوجود وہ بھی اِنکے اقوالِ ذرین اور افکارِ بلیغ کو کتابیشکل میں یکجا نہ کرسکے یا ابتک میری نظر سے ایسی نورانی ضرورت اور علمی مشعل نہیں گزری ۔ اِن کے شاگردِ رشید چوہدری محمد علی مرحوم سابقہ وائِس چانسلر پشاور یونیورسٹی نے ان کے آخری دیدار کے موقع پر اقبال کا یہ شعر ہڑھا:

نشانِ مردِ مومِن بہ تو گویم --- چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

(ترجمہ: تمہیں میں ایک ایماندار شخص کی نشا نی بتاتا هوں۔ مرتے وقت اُس کے لبوں پر اطمینان بخش مسکراہٹ دیکھو گے)۔

آخری آرام گاہ:

آج وہ پشاور یونیورسٹی میں واقع نو گزی بابا بلمقابل پشتو اکیڈیمی میں محوءِ خواب ھیں ۔ اور ان کے مرقد کی لوح پر درج ذیل کتبہ کندہ ہے:

پروفیسر عبدالرحیم نیازی ولد خان بہادر غلام حسن نیازی

پروفیسر فلسفہ و ادبیاتِ شرقیہ پشاور یونیورسٹی

ولادت ۔۔ ۹ دسمبر ۱۸۹۱ء

وصال ۔۔۔ ۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء

اولیاء را چون بوصل افتد د نظر ---- زانکہ ایشان را اجل باشد شکر

تلخ سود پنین ایشان مرگ تن ----- چون روند از چاہ زندان چمن (رومی)

انا للہ و انا الیہ راجعون

''

باب سوم

خدمت اور محبت کا سفیر

پروفیسر عُبید اللہ دُرانی(رح)

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

بہ تسبیح و سجدہ و دلق نیست

ترجمہ: صوفیانہ زندگی مخلوقِ خدا کی خدمت کے بغیر ممکن نہیں ۔ صرف تسبیح پھیرنے سے ۔ اور گُد ڑی پوشی سے کام نہیں بنتا۔

مولانا احمد علی لاہوری(رح) کا قول ہے۔ کہ اصل تصوف خداوند تعالی' کوعبادت۔ رسولِ خُدا ﷺ کو محبت اور مخلوقِ خدا کو خدمت سے راضی کرنے کا نام ہے ۔ پروفیسر عبید اللہ درانی (رح) ایک معروف انجنیر ۔ سائنس دان ۔ ہومیو پییتک ڈاکٹر اور خدا رسیدہ چشتیہ عالیہ کے شیخَ طریقت تھے ۔ وہ موجودہ جنوبی بھارت کے صوبہ اندھر پردیش میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوےء ۔ والد ماجد کی طرف سے د ُرانی پشتون تھے ۔ اِنکی والدہ ماجدہ کا سلسلہ نسب مشہور بزرگ حضرت سید گیسو دراز(رح) سے ملتا تھا ۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِتعلیم تھے کہ اُنہوں نے ایک ایسا سأئنسی آلہ ایجاد کیا جو چوروں اور لٹیروں سے تجوری یا الماری نما صندوق میں نقب زنی سے اِسے محفوظ رکھتا تھا ۔ کیونکہ وہ اس صندوق یا الماری کے مالک کے سِوا ہر کسی کی آہٹ پر بجنے لگتا ۔ اس آواز سے زیادہ حساس آلے کی ایجاد کی شہرت جب قدر دان انگریز سرکار تک پہنچی تو عبید اللہ صاحب کواعلی' تعلیم کیلیۓ شیفلڈ(انگلینڈ) وظیفہ دے کر بھیجا گیا ۔ وہاں سے واپس آکر اُنہوں نے علی گڑھ میں ۱۹۳۵ء میں ایک انجنیرنگ کالج کی بنیاد رکھی۔ اور وہاں بیس سال تک پڑھایا۔ ۱۹۵۵ء میں وہ رضی الدین صدیقی واٗ ئِس چانسلر پشاور یونیورسٹی کی ترغیب پر پشاور تشریف لاۓ ۔ انہیں انجنیرنگ کالج پشاور کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اس پوسٹ پر انہوں نے ۱۹۷۰ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک کام کیا۔ وہ متنوع الصفات عالم تھے ۔ قابل انجینیر' مشفق اُستاد اور کامل شیخِ طریقت ہونے کیساتھ ہو میو پیتھک طب کے ایک حاذق طبیب تھے ۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے ہی میں نامور صوفی اور ولی اللہ بابا تاج الدین ناگوری (ولادت ۱۸٦۱ء بمطابق ۱۲۳۷ھ) کی توجہ کا مرکز بنے۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے دو سال حالتِ جذب میں گذارے ۔ ان کے والد محترم انکو واپس بابا تاج الدین اولیاء کی خدمت میں لے گۓ ۔ جنہوں نے انہیں اس حالت سے نکالا ۔ انکو بابا قادر اولیاءؒ (۱۹۰۳ء بمطابق ۱۳۲۰ھ) کے حوالے مزید روحانی تربیت اور عروجِ روحانی کیلیۓ بھیجا۔ بابا قادر اولیاءؒ نے انہیں چاروں سلسلوں قادریہ۔ نقشبندیہ۔ سہروردیہ اور چشتیہ میں بیعت اور تربیت کی اِجازت دی۔ لیکن بابا دُ رانی (رح) چشتیہ مسلک سے خصوص نسبت رکھتے تھے۔

علی گڑھ میں میڈیکل کے ڈاکٹروں نے ان کی ایک ایسی بیماری تشخیص کی جو خطرناک حد تک پہنچ چکی تھی ۔ لیکن جب ہومیو پیتھک طریقہ علاج سے معجزاتی طور پر ان کو مکمل شفا عطا ہوئ تو انہوں نے اَسی طریقہ علاج کا بیڑہ اُٹھایا ۔ روکڑہ میں شیخ علاؤ الدین کی زیارت کی اور وہاں سے انہیں اس کیلیۓ خصوصی اجازت اور فیض عنایت ہوئ۔ ان کا مطب انکی وفات کے بعد انکے بیٹے جہانگیر درانی اور بہو بیٹی ڈاکٹر صبوحی پشاور یونیورسٹی کیمپس میں چلا رہے ہیں جہاں عوام و خواص کو مفت طبی علاج مہیا کی جارہی ہے ۔ ۲۰۰٦ء میں بعد از وفات عبید اللہ درانی کو ہومیو پیتھی کے میدان میں نمایاں خدمات دینے پر ہومیو پیتھک کونسل حکومت پاکستان نے انعام و اکرام سے نوازا ۔

بُنیر میں مطب و آستانے کا قیام ۱۹۸۲ء

بابا دُرانی کی نظر میں اپنے مہربان اللہ تک رسائ کا آسان راستہ انسانیت کی خدمت ہے ۔ وہ جمعہ یا اتوار (سرکاری چھٹی کی مناسبت سے) کو صبح سے مریضوں کے علاج میں مصروف ہوجاتے ۔ اس دن انکی سرکاری رہائشگاہ ایک مصروف و مقبول مطب کا منظر پیش کرتی ۔ رضاکار اور کارکُن مریضوں کی مفت تشخیص کرتے۔ اور دوائیاں پیک کرکے دیتے۔ مریضوں اور سائیلین کا ایک ہجوم گھر پر جمع ہوتا۔ دُرانی صاحب پوری توجہ سے ان کے مسائل سُنتے تھے ۔ شام کے وقت ان کے کسی معتقد کے گھر پر ایک مجلس ہوتی۔ مختلف موضوعات پربحثیں ہوتیں تھیں اور شرکاۓ مجلس کے قلوب کو تلاشِ حق کی ترغیب دیتے۔ درانی صاحب ہر سال اپنے شیوخ کے عُرس بڑی عقیدت اور احترام سے مناتے۔

گرمیوں میں وہ قادر نگر(بُنیر)تشریف لے جاتے جہاں انہوں نے اپنی گرمیوں کی رہائش گاہ تعمیر کی تھی ۔ یہاں بھی ان کے مُرید زیارت اورملاقات کیلۓ حاضرہوتے۔ بعض تو سارا گرمیوں کا سیزن گذارتے اور دیگر چند دنوں تک قیام کرتے۔ یھاں کے ماحول پرخراسان کے مشہور ولی ابوسعید ابن الخیر(وفات ۱۰۴۹ء) کے اصولوں کے محتاط اطلاق کا گمان ہوتا۔ خانقاہ کی سیاحت کرنے کیلۓ آنے والا ملاقاتی چونک جاتا جب وہ سندھ کے کسی بڑے وڈیرے جاگیردار کو صحن میں جھاڑو سے صفائ کرتا ہوا پاتا، اور ایک بڑے معالج کے ناز پرورده بیٹے کو انتہائ انکساری سے زائرین مہمانوں کی خدمت کرتے دیکھتا ۔ ان کے قریبی معتقید ین میں پڑھے لکھے ہر پیشے کے لوگ شامل تھے ' جیسے بیوروکریٹس۔ ججز۔ ڈاکٹر۔ انجنیٔر۔ پروفیسرز۔ کارخانہ دار۔ جاگیردار۔ کاروباری حضرات اور طالب علم سب ہی ۔ ایک سطحی کوتاہ نظر ملاقاتی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اِس داڑھی چٹ ۔ اکثرمغربی طرز کی پینٹ اوربُش شرٹ میں ملبوس شخص میں اعلی' ولایت کا کوئ شیبہ بھی ہوسکتا ہے۔ صرف انکے قریبی صا حبِ نظر ساتھیوں اور متعلقین پر یہ راز عیاں تھا۔ (زندگی کے آخری سالوں میں وہ شکل سے پورے سادھو دِکھائ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے کو ایک لمبی گھنی چتکبرے رنگ کی داڑھی سے سجا لیا تھا۔ دور سے تو ان پر اپنے وقت کے ٹیگور یا رحمان بابا کے سٹائِل کا گمان ہوتا تھا)۔

درانی صاحب ایک عمیق صاحبِ نظر انسان اور ایک کامل نفسیات دان تھے جو انسانی فطرت کے اندرونی مشاہدے کی ایک گہری بصیرت کے حامل بزرگ تھے۔ صرف ان کے قریبی احباب کو ہی یہ معلوم تھا کہ وہ کس اعلی' طریقے سے بعض چشتیہ وظائف و لطائف کو کردار سازی کیلۓ بروۓ

کار لاتے ہیں۔ انکے قریبی معتقدین اور سابقہ طلباء کے کہنے کے مطابق وہ فرد کی روحانی نمو اور تربیت کیلئے رسول ِاکرمﷺ کی اتباع یعنی صحبتِ شیخ پر عمل پیرا تھے۔ البتہ یہ بات اِن کے بارے میں عام طور پر کہی جاتی ہے کہ اُنھوں نے کسی معتقد کو کوئی خاص مشق کرنے کی تلقین نہیں کی۔ مثلا" مراقبہ ۔ مجاہدہ یا ریاضت۔ حقیقت میں معتقدین مشکل سے یہ جان پاتے کہ ان کی تربیت اور تیاری کی جارہی ہے۔

بابا کا یہ نظریہ تھا کہ اس جٹ ہوائی دور میں وہ افراد جو جذبۂ خدمت سے معمور ہیں' کی تربیت اور نمو اس طور سے کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ جلد سے جلد میدانِ عمل میں کود پڑیں۔ سالک کو بڑے احتیاط سے ایک کلمہ ذکر دیا جاتا اور تاکید کی جاتی کہ اس کلمے کا وِرد دِل میں رات کو سونے سے پہلے یا پھر کسی بھی وقت یاد آنے پردُ ہرائے۔ دوسرے مواقع پر عموما" تصور میں یہ عمل پذیر کرنا پڑتا۔ ذِکر اورتصور کے یہ باہم توام (جڑواں) روحانی اِرتقا کا طریقہ معلوم ہوتا ہے جو کہ روحانی شعور کیلئے آجکل کے چشتیوں سے لیا گیا ہے۔ بابا دُرانی نے ذکرِ خفی پرزور دیا ہے۔ جو انکے نظریہ کے مطابق حقیقت کے دائرے میں کام کرتا ہے ۔ بابا درانی کی نظریاتی وابستگیاں کیا تھیں؟ ان کے خیال میں ذِکرِ جلی اور ذ کرخفی ایک دوسرے سے جدا ھیں۔ ذکرِجلی شریعت کے دائرے میں ہے۔ اول الذکر سالک کو غیر معمولی کمالات ظاہر کرنے پر قادر کرتی ہے ۔

جب کہ ذکرِخفی کا تعلق ایک مختلف سمت سے ہے۔ یہ ہمہ عشق کا معاملہ ہے اور اس حدیث پاک کا بھید ہے کہ' میں ایک خفیہ خزانہ تھا اور چاہا کہ پہچانا جاؤں'۔ ذکرِ خفی تحتِ شعوراور لا شعور کے پوشیدہ گوشوں کی سطحوں پر اپنا کام کرتا ہے ۔ ذہانت اور حواس سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ (طبعی مرگ سے قبل موت (موت قبل ان تموتو!!!) کے طفیل سالک د قیق وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے ۔(ایک حسین چہرے کے تصور سے حُسنِ پنہاں تک) اور اس اکائی تک باطنی نظر کی رسائی حاصل کرلیتا ہے جو ساری خلقت میں پوشید ہ ہے۔ شاید کوئی دُرانی صاحب کی بات سے یہ مطلب حاصل کرے کہ شریعت کے ذریعے ذکرِخفی کا ادراک نہیں کیا جاسکتا اور ان کا مقصد روحانی بصیرت ہے ۔ پھر اس وقوعے کا طریقہ کار کیا ہے؟۔

اِن کے مطابق صرف ایک شیخ جو عالم جبروت(قدرتِ کاملہ) کی سلطنت میں اپنا مقام حاصل کرچکا ہو' کی نظرِتوجہ سے یہ سب کچھ ہو تا ہے ۔ جب فرد کی روح اپنی انفرادیت کے خول سے نکل کر روحونکے اجتماع (اجتماعیت) میں حضور ﷺ کے تحت شامل ہوتی ہےَ یہی حالت نسبتِ محمدیﷺ کہلاتی ہے۔ شیخ کے برزخ سے سالک کو پیغمبرﷺ تک لایا جاتا ہے۔ یہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایک درمیانی مرحلہ ہوتا ہے ۔ سالک جو مرگِ طبعی سے قبل مرکزِ فنا فی الشیخ کے مقام پر پہنچ جاتا ہے ۔ تو اِسے اپنی روح کی وسعت کا عجیب احساس ہوتا ہے ۔ اور یہ مقامِ مشاہدہ ہے ۔ ایک بیدار روح ہی مشاہدے کے قابل ہوتی ہے ۔ اور پھر حقیقی معنوں میں سالک شہادت دینے کا درجہ حاصل کرلیتا ہے ۔

سالک کیلئے ضروری ہے کہ اس تعلق کو قایٔم رکھے۔ اور سُنت کی کامل مطابقت سے اسے تکمیل تک پہنچائے۔ ظاہری سنت اور خاص کر پیغمبرﷺ کی باطنی سُنت یعنی مخلوقِ خدا کی خدمت۔ رسولِﷺ سے ایسا نیا تعلق پیدا کرنے کے بعد سالک غیب تک رسائی حاسل کرلیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے میں وجود کی کایا پلٹ یا وسعت وقوع پذیر ہوجاتی ہے ۔ اور سالک ایک متکبر خود شناس (ایگو سنٹرِک) وجودیت سے اجتماعی(کامونل) ذات اختیار کرجاتا ہے۔ اور وجودِ کامل کا حصہ بن

جاتا ہے۔ جہاں وہ نجات یا ذاتی بقا سے علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ ساری مخلوق کی بہتری کا سوچتا ہے ۔ ایک کامل شیخ یہ اختیاار رکھتا ہے کہ سالک کو خفی سے ملا دے ۔ ایسا تب واقع ہوتا ہے جب شیخ سالک کو اِسمِ ذات کے وِرد کی اِجازت عنایت کرتا ہے۔ دُرانی بابا فرماتے تھے کہ اِس بات میں اِسلام کی دوسری مذاہب پر برتری پوشیدہ ہے ۔ اور یہ پوشیدہ خزانے کی کلید(کُنجی ۔ فتح) پیش کرتا ہے ۔ سالک کی سُنت کی تکمیل ٓاس وقت مکمل ہوجاتی ہے اگر وہ اللہ پاک سے تعلق جوڑ لیتا ہے لیکن ساتھ ہی خلق میں بھی شامل ہوتا ہے ۔ (حق سے واصل اور مخلوق میں شامل) ۔ اِ س لئے مخلوق کی خدمت ضروری ہے۔ ذکر کے سفر میں پہلے سالک فنا کے مختلف مراحل اور درجات سے گذرتا ھے۔ جب سالک فوت ہوجاتا ہے تب وہ شیخ کی توجہ سے دوبارہ نیا جنم لیتا ہے ۔ اوراِسے مشاہدہ حق (شھادہ) کا مقام مل جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوفیا کرام کے نزد یک شھادت کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک ظاہر کی طبعی شھادت کی موت اور دوسری باطنی قسم جس میں یہ کمزور و غیر وجود ذات مر جاتی ہے ۔ روح دوبارہ جنم لیتی ہے اور اپنی جیسی روحوں اورشہداء سے مل جاتی ہے۔ یہ ایک اختلافی متنازع مسئلہ ہے جس سے علماء دیو بند اجتناب کرتے ہیں ----- (یاد رہے کہ اقبال بھی "اندر وجود" کی بجائے "اندرحضور" کے قائِل ہیں) ۔ فرماتے ہیں :

ما ترا جوئیم و تو از دیدہ د ور ---- نے غلط' ما کو ر و تو اندرحضور

ترجمہ: ہم تجھے ڈھونڈ رہے ہیں اور تو آنکھوں سے دور ہے ' نہیں نہیں یہ غلط ہے' ہم اندھے ہیں تو تو سامنے ہے ۔

قرآنِ پاک میں نبیّن۔ صدیقین ۔ شہداء اور صالحین کو انعام یافتہ بہترین(محسنین) شخصیات میں شامل بتایا گیا ہے ۔ تو کیا قرآن عظیم کی اصطلاح "شہداء" کا مطلب وہ لوگ نہیں جو "اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ؟" ۔ صوفیا کے مسئلک کی تشریح و توجیہہ کی معاون نظر آتی ہے۔ شہادت کا مقام پیغمبر ﷺ کی سنت کی مکمل پیروی خاص کر انسانیت کی خدمت کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ناقدین کا یہ اعتراض کہ تصوف قرآن کے نظریہ کو اُلجھا اور مروڑ دیتا ہے۔ اور صوفیا انسانیت کی فلاح و بہبود میں کوئ مثبت کردار ادا نہین کر رہے اس لیے کہ ان کا ذہن پہلے ہی نفس کشی میں مصروف ہوتا ہے ' غیر ضروری ہے ۔

اِن باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بابا درانی ایک جدید صوفی کا نمونہ پیش کرتے تھے ۔ جنہوں نے صدیوں پُرانے وضع کردہ قاعدہ اور طریق کو موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق قبول کیا۔ سخت ریا ضت کی مُشقتوں کو صحبت۔ توجہ اور کشش میں بدل دیا۔ سائِنس اور ٹیکنالوجی اپنے ساتھ بیشمار فوائِد لائے اور مادہ پرستی کا دور شروع ہے ۔ آزادئ فکر کی عادت اور تجزیہ کا عمل جاری ہے ۔ اندھی تقلید جو شیخ اور مُرید کے تعلق میں ایک اہم ضرورت ہے' پر اس زمانے میں مشکل سے ہی عمل کیا جاسکتا ہے ۔ بابا درانی اس ماحول سے واقف تھے جس میں وہ کام کرتے تھے ۔ اس لیے مرید کو شازو نادر کسی کام کے کرنے یا روکنے اور منع کرنے کا حکم دیتے تھے ۔ صوتی یا نطقی دعا اور دیگر روحانی مشقتیں(مجاہدہ ۔ ریاضت وغیرہ) ضروری نہیں سمجھی جاتیں اور شیخ سے جوڑ ۰ ملاپ) اور محبت اس کا متبادل ہے ۔ اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ سالک کی اپنی

کوششوں سے زیادہ شیخ کی اثر پزیری اس کی روحانی ارتقا میں کار فرما ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ توجہ اور جذب(کشش) ان سخت رہبانہ مشقتوں کی جگہ لے رہے ہیں جو سالک کیلۓ ضروری تھیں ۔

بابا درانی کیلۓ ذِ کرِ خفی شریعت یا طریقت کی حد ود میں نہیں آتے ۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ دراصل تصوف کی شناخت شریعت یا اِسلامی فقہ (جورِس پروڈینس) کے حوالے سے نہیں ہوسکتی جیسے کہ بعض صوفیاء کا نکتہ نظر ہے۔ ذکرِ خفی کا سبق صرف ایک کامل شیخ ہی سکھا اور پڑھا سکتا ہے ۔ جس میں یہ قابلیت پائ جاتی ہے کہ سالک کو غیبی (خفیہ) خزانے تک پہنچاۓ ۔ اس واسطے کے بغیر یہ رسائ ممکن نہیں ہے۔

بابا عبیداللہ دُرانیؒ کی تعلیمات :

بابا عُبیداللہ درانیؒ نے اپنی ساری زند گی سماجی ۔ معاشرتی اور رفاعی کاموں کیلۓ وقف کردی تھی ۔ وہ خود معروفیت کی نصیحت ہر کسی کو دیا کرتے تھے ۔ اس کی تشریح وہ یوں کرتے کہ اپنی ذاتی د لچسپیوں یا مفادات سے دوسروں کے مفاد کو مقدم اور عزیز جانو۔ دوسرے معنوں میں یہ سمجھو کہ دوسروں کے مفاد کو اپنی ذات سے ماوراء رکھو ۔ یہ بات تمہیں سدا بہار اور سچی خوشی بخشے گی ۔ خداوند پاک تک رسائ کا مختصرترین راستہ اس کے مخلوق سے گذرتا ہے۔ خداوند تعالی'کومخلوق میں تلاش کرو۔ ان کی مدد کرکے ۔ انکا خیال رکھ کر اور ان کے غموں اور خوشیوں میں حصہ لیکر۔ اسلام کا اصل جوہر"جمعیت بندی" یعنی بندوں کے درمیان محبت کی بندھن اور لوگوں کے درمیان بے غرض تقسیم قائم کرنا ہے۔ بابا عبیداللہ دُرانیؒ پیغمبر اسلام حضرت محمدﷺ سے بے حد محبت کرتے اور ان سے عقیدت اور احترام کا عظیم رشتہ ہر حال میں برقرار رکھتے۔ وہ تصوف کے راستے سے حقیقت کی تلاش میں سرگردان تھے۔ اوائِل عمر میں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری سے روشناس ہوۓ جس کی وجہ سے ان کی دلچسپیوں کا رُخ تصوف کی طرف مُڑ گیا ۔ ابتداء میں وہ ناگپور(بھارت) کے بابا تاج الدینؒ اور بعد میں ویجیا ناگرام (بھارت) میں قادر نگر کے بابا قادر اولیاءؒ کی پیار بھری رہنمائ میں تلاشِ ذات کی راہ پر روانہ ہوۓ۔ یہ جستجو تا دمِ مرگ جاری رہی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ انکو انکی یہ فکر بانٹنے کیلۓ ساتھی ملتے گۓ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔

قادِرنگر کا قیام:

اللہ کے بندوں کو ہر دور میں اپنے عظیم خالق و مالک سے لَولگانے کیلۓ آبادیوں سے دُ ور پہاڑوں اور صحراؤں میں گوشہ عافیت کی تلاش رہی ہے ۔ بابا صاحب کو حسین وادیوں کا علاقہ سوات بھایا ۔ سوات کی وادی بُنیر میں زمانوں سے ایک عظیم ہستی اور صوفیاء کے قافلے کے سرخیل حضرت پیر باباؒ مدفون ہیں ۔ یہیں پر عبیداللہ دُرانیؒ نے بھی اپنے پیر و مُرشد بابا قادرؒ کے نام سے منسوب قادر نگر آباد کیا ۔ وہ اکثرگرمیوں کی تعطیلات میں یہاں تشریف لاتے۔ خنک موسم سے فیض یاب ہونے اوربابا جی سے ملاقات اور فیضِ صحبت کیلۓ۔ ان کے بیشمار معتقدین اور شیدائ قادر نگر آتے رہتےجہاں دُرانی صاحب اپنے مُرشید ین بابا تاج الدین اور حضرت قادر اولیاؒ کے سالانہ عُرس

مناتے۔ بابا دُرانی نے یہیں ۱۹۹۰ء میں قادر آباد میں جان جانِ آفرین کے سپرد کردی اور ان کی وصیت کے مطابق یہیں مدفون ہوئے۔ یوں یہ جگہ مرجعِ خلائق ٹھہری ۔

تصانیف:

"When the voice of the silent touches my words, I know him and therefore, I know myself ....Rabindranath Tagore."

(ترجمہ : جب ایک خاموش دم بستہ صدا میرے الفاظ سے مَس ہوتی ہے ۔ تب مجھے اس کی معرفت بھی حاصل ہوجاتی ہے)۔

(1) "Whither ye Sadhu?"
(سادھو تُم کہاں جارہے ہو؟)

پروفیسر عبید اللہ دُرانی کع انگریزی تصنیف ہے ۔ دُرانی بابا ؒبنیادی طور پر ایک صوفی بزرگ تھے۔ اِس کتاب میں سالک ایک آرِیَن نسل باشند ہ ہےجو سامی نظریات کے مطابق اپنے صوفیانہ منازل طے کرتا ہے۔ کتاب کی زبان خاصی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ لالا عبد الرحیم نے اِس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے۔

(2) "The Evolution of Faith"

اصل کتاب دُرانی صاحب نے "عقیدے کا اِرتقا" کے نام سے اُردو میں لکھی ہے ۔جسے اِن کی بھانجی "نعیمہ بی۔ ھین" نے انگریزی میں ترجمہ کرکے شائع کیا ہے ۔ یہ اِنسانوں اور خدائے رحمان و افضل کے درمیان تعلق اور رِشتے کے بارے میں ایک صوفی کی تحریر ہے جو خدائے واحد کو ماننے والے مذہبوں کے اِرتقا کے بیان کا اِحاطہ کرتی ہے ۔ کتاب یہ خیال پیش کرتا ہے کہ چاروں مذہبی نظاموں میں تقسیم مصنوعی ہے ۔ باوجود اِس کے کہ چاروں عقیدوں کا اندرونی حصہ خالق اور مخلوق کے درمیان محبت کا رشتہ ہے ۔ اِس کتاب کا لُب لباب مختصرا" یوں ہے: " دنیا میں فقط ایک ہی امن اور عقیدت کا دین ہے: دینِ ابراہیمی ۔ دینِ موسوی ۔ دینِ عیسوی اور دینِ اِسلام ۔ یہ سب دین فطرت کے چار اِرتقائ منازل ہیں ۔ اِس حقیقت کی تائید اور تصدیق خاتم الرسل حضرت محمدﷺ کی یہ حدیث مبارک ہے : " ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے ۔ ماں باپ اِسے یہودی ۔عیسائ یا مسلمان بنادیتے ہیں" ۔ تخلیقِ آدم کے پہلے روز سے سب ارواح نے اللہ تبارک و تعالی' کو اپنا رب اور رازق تسلیم کیا تھا۔ اب اگر کوئ اِس عہد یا وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو ایسا کرنا دنیاوی غلاظت کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اسلام آغاز ہی سے ایک بنیادی سچای اور متحرک قوت رہی ہے ۔ اور ایسا ہمیشہ رہیگی۔" ------------------ مختلف اوقات میں قوموں کی تاریخ ایسے کئ واقعات سے بھری پڑی ہے جہاں ذات کی بیرونی اور اندرونی (ظاہر اور باطن) کے درمیان کشمکش بربادی اور اداسی پر مُنتج ہوتی ہے ۔ لیکن دینِ فطرت نے اپنا سفر جاری رکھا ۔ اور درمیانی صحیح راستہ (شاہراہٗ اوسط یا صراطِ مُستقیم) کی طرف بلاوا دیتا رہا ۔ پیغام بران کرام اگلی منزل کی طرف شمع روشن کرتے رہے حتی' کہ وہ "الاسلام"کی منزل زیبا

پر پہنچے ۔یہ کارواں اب بھی رواں دواں ہے ۔ اگر ہم ماضی سے رواں کاروانوں کے نقشِ پاک کا جائزہ لیں تو دِل سے یہ آواز آتی ہے:

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

(مولانا حالیؒ کی روح سے معذرت کیساتھ)

اِسلام کی جڑیں جہانِ ابدی کی لا فانی روح۰آتما) میں پیوستہ ھیں ۔ اِس مقام کو پانے کیلئے سالک کو کائِناتی مادہ وجود سے پرے جانا ہوگا ۔ اسی لیے تو ڈاکٹر اقبالؒ نے کہا ہے:

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے' منزل نہیں ہے ۔

(3). Char Islam?

Spiritual journey of Islam from Abraham, Moses, Jesus to Muhammad. Obaidullah Durrani with guidance from Baba Qadir Awlia.

(4). حیاتِ قادر

(5). دُرِ عینی ترجمہ ولی الدین

(6). حکمت فروغ کُن ۔ جلد اول و دوم

(7). www, Blissmedia.com

''

معاصرین کے ساتھ تعلقات

لالا عبد الرحیم نیازی(مرحوم) بنیادی طور پر فلسفہ اور فارسی کے اُستاد تھے ۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج بنوں کے پرنسپل بھی رہے ۔ پشاور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر چودھری محمد علی مرحوم ان کے اولین شاگردوں میں سے تھے ۔ اور ان کی خدمات اور طلباء کی کردار سازی میں کردار کے پیشِ نظر انکو اعزازی پروفیسر کا عہدہ دے کر یونیورسٹی کیمپس پر رہائش مہیا کی ۔ لالا صاحب اگرچہ خود رُشد و ہدایت کے قندیل تھے لیکن دُرانی بابا کے روحانی فیوض اور دستِ شِفا کے قائل تھے ۔ دونوں کے آپس میں گہرے روحانی رابطے تھے ۔ ایک دفعہ راقم الحروف نے لالا صاحب سے اپنی چند جسمانی اور روحانی عوارض کے بارے میں مشورہ مانگا۔ اُنہوں نے یہ فرماکر مجھے دُرانی صاحب کے ہاں بھیجا کہ دُرانی بابآ کو اللہ تبارک تعالی' نے دستِ شِفا اور خاص روحانی فیض بخشا ہے ۔ یہاں تک کہ اگر کسی مریض سے اسکا نسخہ اور دوا کی گولیاں اور پُڑیاں گُم بھی ہوجائیں، تب بھی دوائ اپنا اثر دِکھاتی ہے۔ اور مریض کو اللہ پاک مکمل شفا عنایت کردیتا ہے۔ خیر میں دُرانی صاحب کے پاس لالا صاحب کی سفارش لیکر حاضر ہوگیا۔ اُنہوں نے توجہ اور شفقت سے میری تکالیف کو سُنا اور پُڑیوں میں تھوڑا تھوڑا سا سفوف ڈال کر صبح خالی پیٹ مکھن کیساتھ کھانے کی ہدایت کی ۔ یہ میرے خیال میں سچی محبت ، قلبی تعلق ۔ یقینِ صادق اور اندھی تقلید کا معاملہ ہے۔ جس پر یہ سارا نظام قائم ہے۔

(۲) حضرت امیر حمزہ شِنواری ؒ پشتو ادب میں ایک نابغہ اثر شخصیت گذری ہیں۔ انکے بھی دُرانی بابآ کیساتھ عرصہ دراز تک خوش گوار نیازمندانہ باہمی عقیدت و احترام کا تعلق رہا۔ راقم الحروف کے نام ایک خط محررہ ۲۹ جون ۱۹۸۱ء میں لکھتے ہیں۔ " رواں مہینے کی ۱۰ تاریخ کو بوقت عصر عازمِ پیر بابا ؒ ہوا۔ وہاں میں اکثر محمد عبیداللہ خان دُرانی کے پاس جاتا ہوں۔ میرے ان کے ساتھ ۲۰ سالوں سے تعلقات ہیں۔

اس ہیچ مدانی کا ایک مضمون پشتو اکیڈیمی کے رسالے "پشتو" کی اشاعت جون ۱۹۸۲ء میں بعنوان " کائنات حق تعالی' کی علمی تخلیق ہے" شائع ہوا۔ حمزہ بابا مرحوم اپنے ایک خط تحریر کردہ ۳۰ جون ۱۹۸۲ء میں ایک بار پھر قادر نگر اور دُرانی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:" میں ۳۱ مئ کو قادر نگر گیا تھا۔ اور ۱۹ جون تک دُرانی صاحب کا مہمان رہا۔ جیسا کہ ہر سال ان کے پاس جاتا ہوں اور چند دن وہاں گذارتا ہوں۔ تمہارا مضمون "پشتو" رسالے میں نظر سے گزرا۔ پڑھا ۔ بہت اچھا تھا۔ میرے خط کا بھی حوالہ دیا تھا۔ بڑی عنایت ہے (ڈیرہ مننہ) ۔اسی طرح ایک بار راقم الحروف نے " علمِ تاریخ کی روحانی اور وجدانی تعبیر" کے بارے میں حمزہؒ سے یہ استفسار کیاکہ کیا درانی بابا اس سلسلے میں کمترین کی مدد کرسکتے ہیں؟ اُنہوں نے مورخہ ۲۔۹۔ ۱۹۸۳ء کوایک جوابی خط میں لکھا" درانی صاحب یقینا" تمہاری رہنمائ فرما سکتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مجلسِ شوری' کے اِجلاس کیلئے اسلام آباد تشریف لے گئے ہونگے۔ البتہ وہ شجر کاری کے سلسلے میں قادر نگر پیر بابا جاتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ شوری' کے اجلاس کیلئے نہ گئے ہوں۔ وہ یونیورسٹی میں اپنے بھانجے پاشا کے ساتھ رہتے ہیں۔

جمعہ کے دن کئ لوگ دوائیوں کے لیے ان کے پاس آتے ہیں۔ دوائ مفت دیتے ہیں۔ سپین جمات کے پاس ٹانگے کھڑے ہوتے ھیں۔ وہ سب دُرانی صاحب کی رہائیش گاہ سے واقف ہیں۔
زندگی کے آخری سالوں میں حمزہ صاحب ایک اضطراب۔ کرب ۔ درد اور تکلیف کے دور سے گزر رہے تھے۔ حمزہ صاحب کا خیال تھا کہ دُرانی باباانہیں اپنے روحانی سائے اور اثر میں لانا چاہتے تھے۔ روحانی گرفت اور کشمکش کے ایسے ہی لمحے انہیں اُس وقت بھی پیش آ ئے تھے جب حویلیاں ضلع ہزارہ کے مشہور مُحد ث اور عالم محمود شاہ المعروف محدث ہزاروی نے انہیں اپنے مُر ید بھیج کر بلوایا۔ پہلے انہیں عبا قبا پہنائ اور پھر چاروں سلسلوں میں خلافت دے کر حیران کردیا تھا۔ اب حمزہ بابا پہلے ہی سے مشہور بزرگ پشاور کے سید عبد الستار بادشاہؒ کے مُرید اور خلیفہ مجاز تھے۔ اور یہ نسبت بہت زیادہ قوی اور ناقابلِ شکست تھی۔ حمزہ صاحب نے مرحوم عبدالرحمان لوگَے کاکا خیل' جو ان کے قریبی عزیز ' معتقد اور رازدان تھے ' کو دُرانی باباؒ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے پُرزور لہجے میں بابا سے کہا۔ کہ وہ انہیں آزاد کردیں۔ بابا نے بڑی شفقت سے انہیں سمجھایا کہ سلوک کی راہوں میں صرف محبت و اُلفت کی قند یل روشن ہوتی ہے۔ یہاں زور۔ نفرت اور زبردستی سے کام نہیں ہوتا۔ لوگَے صاحب نے ان سے لکھواکر حمزہ صاحب کو یہ پیغام پہنچایا، اب عرصہ ہوا عبد الرحمان لوگئ نے یہ عجیب واقع مجھ راقم الحروف کو سُنایا تھا۔ پیغام کے الفاظ مختلف ہوسکتے ہیں۔ لیکن مطلب و معنی یہی تھے۔ ۔

بابا دُرانی صاحب اور ظفر بیگ بھٹنّی :

-

ظفر بیگ انجبیرنگ کا لج پشاور کا ایک ذہین ۔ زیرک۔ تیزطرار اور پشتون کی آبرو ہر مر مٹنے والا نوجوان تھا۔ ان کے ایک سینئیر پنجابی اُستاد کی یہ عادت تھی کہ جماعت میں جب کسی انسان یا حیوان کی حماقت۔ ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر کرتے تو مثال یہ کہہ کر دیتے کہ"بالکل ایک پتھان کی مثل"(جست لائیک اے پٹھان) ۔ یہ الفاظ اُستادِ محترم کا ایک قسم کا تکیہ کلام بن چُکا تھا۔ کلاس کی طلباء کی اکثریت پٹھانوں کی تھی۔ ان کو غیرتِ قومی کی وجہ سے یہ بات بُری محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اُستاد کے احترام اور کلاس کے اِنتظامی قواعد کے پیشِ نظر خاموش ہوتے۔ لیکن جب یہ استاد کا روز کا معمول بن گیا تو آخر طلباء نے ظفر بیگ سے یہ کہہ کر رجوع کیا کہ کلاس میں تمہارے ہوتے ہوئے پشتون قوم کی غیرت کو کیسے للکارا جارہا ہے؟۔ دوسرے ہی دِن ظفر بیگ اگلی قطار میں بیتھ گیا اور جونہی اُستاد نے حسبِ عادت "جسٹ لائیک اے پتھان" کے الفاظ بولے' ظفر بیگ نے فورا" اُٹھ کر اُستاد کا گریبان پکڑ لیا۔ پروفیسر نے چیخ کر وجہ پوچھی۔ "یہ کیا بد تمیزی ہے؟"۔ ظفر بیگ نے برجستہ جواب دیا" جسٹ لائیک اے پٹھان" اور اُسے تختہ سیاہ پر پٹخ دیا۔ خیر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لوگوں نے باھر سے آکر بیچ بچاؤ کیا۔ اُستاد نے سیدھا پرنسپل کے دفتر کا رُخ کیا۔ پرنسپل دُرانی صاحب سے شکایت کی۔ جلد ہی ایک چپراسی نے آکر پرنسپل کیطرف سے اظہارِ وجوع کا ایک نوٹس ظفر بیگ کو تھما دیا جسمیں اِسے ذاتی سماعت کیلیۓ دفتر میں طلب کیا گیا تھا۔ اور بظاہر یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ ظفر بیگ کو کالج سے خارج کردیا جائیگا۔ اُن ہی دنوں پیربابا ؒ کے قریب ہی قادر نگر میں دُرانی صاحب

ایک خانقاہ تعمیر کررہے تھے۔ ظفر بیگ علی'الصبح کالج پہنچا۔ جونہی پرنسپل دُرانی صاحب نے دفتر میں اپنی کُرسی سنبھالی۔ ظفر بیگ ا ند ر داخل ہوا اور دُرانی صاحب کے قدموں میں گِر پڑا اور اِن کے دونوں ہاتھ چومنے لگا۔ دُرانی صاحب نے حیران ہوکر پوچھا"نیٹا کیا بات ہے؟"۔ ظفر بیگ کی پرنسپل کے ہاتھوں کی گرفت شد ید تر ہوگئ۔ عرض کیا "جناب! آج مجھے اپنی روحانی پیاس بُجھانے دیں۔ کئ روز سے بے قرار تھا۔ روحانی کَرب میں مبتلا تھا۔ رات پیر باباؒ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے رو رو کر اپنا حال بیان کیا اور مد اوا چاہا۔ اُنہوں نے فرمایا۔ "بیٹا! اب تو میرا وِصال ہوچکا ہے۔ عالم ظاہر میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔ آجکل میرے یہ سب فیوضات پرنسپل دُرانی صاحب کے پاس ہیں۔ اُنکے پاس جاؤ۔ اللہ تعالی" بھلا کریگا۔ اور یہ ہے آج میں حاضر ہوں۔ اللہ تعالی' کا نام ۔ پیر باباؒ کا واسطہ۔ میرے حال پر رحم فرمائیں۔"۔

دُرانی صاحب تو تھے ہی ایک صاحِبِ دِل اور مُشفق اِنسان ۔ انہوں نے اِس روحانی پیاسے سے فرمایا "تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ہر جمعہ کو میرے بنگلہ پہ آؤ۔ مریضوں کی خدمت اور خلقِ خُدا سے محبت کو اپنا شِعار بناؤ اور فیوض و برکات کے خزانے لُوٹو"۔ آخر میں اُٹھتے ہوئے ظفر بیگ نے آہستہ سے پوچھا "جناب ۔ َآپ نے مجھے طلب فرمایا تھا۔ دُرانی صاحب نے اسے فقط اِتنی نصیحت کی۔ "بیٹا! اُستادوں کی تھوڑی سی عزت کرو"۔ یوں پشتون ننگ و ناموس بحال کرنے کے کامیاب معرکے کے بعد ساتھی اُسے تُر تُری بیگ کہنے لگے۔ اُدھر متعصب پروفیسر نے بڑا زور لگایا۔ کہ اس کی سخت بے عزتی ہوئ ہے۔ لیکن دُرانی صاحب نے اُسے یوں سمجھا نے کی کوشش کی ۔ کہ ظفر بیگ سے یہ حرکت حالتِ اِضطراب میں سر زد ہوئ ہے۔ اور سلوک کی راہ میں ایسے سخت منازل آتے رہتے ہیں۔ اِس حالت میں سالک کا مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر نے کافی شور اور پُرزور احتجاج کیا۔ لیکن دُرانی باباؒ نے ظفر بیگ کے سر سے اپنی شفقت کا سایہ نہیں اُٹھایا۔ نتیجتا" پروفیسر نے شدید حالتِ قہر میں نوکری ہی چھوڑ دی۔

اقوالِ دُرانیؒ :

۔ حق کی تمہیں تلاش کیا ہوگی۔ حق کو تم جانتے ہی کیا ہو اور تمہیں کیا خبرکہ خود حق کو تمہاری کتنی تلاش ہے؟ حق کی آواز ہے کہ تم مجھ میں سما جاؤ اور میرا بول بالا کرو۔

۔ کلمہ طیبہ پڑھنا کمال نہیں بلکہ خود کلمہ ہوجانا کمال ہے۔فقیر گو ظاہر میں کلمہ نہ پڑھتا ہو مگر باطن میں وہ خود کلمہ ہوجاتا ہے' جو اسی مٹّی کے پُتلے کو طیّب بنا دیتا ہے۔

۔ نماز کی روح انسان کو انسان بناتی ہے' اگر نماز اِنسان کو انسان نہ بنا سکے تو وہ نماز ہی نہیں۔

۔ عبد ہونے کی پہچان "وفا" میں ہے۔ جب تک اپنی روح میں قیام نہ ہو' وفا کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔

۔ زندگی کا بنیادی نطریہ یہی ہے کہ مثبت پہلو پر نظر رکھی جائے ۔

۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے موجودہ زمانہ بہترین زمانہ ہے' بد سے بد تر بن کو بھی ذرا راستہ ملے تو اس کی بُرائیاں غائب اور روشنیاں غالب آجاتی ہیں۔

خلافت :

عبید اللہ درانی مرحوم کے اگرچہ کافی پڑھے لکھے ۔ عالم فاضل اور خدمتِ خلق سے سرشار مُرید اور مُعتقید ین تھے ۔ لیکن اُنہوں نے کسی کو بھی خلافت سے نہیں نوازا۔ وہ سب ایک دوسرے کو محض" بھائیؑ" کہہ کر یاد کرتے۔ البتہ ان کے بعض احباب اورخاند ان کے افراد انہیں ایک انتہائیؑ عزیز دانشمند بزرگ سمجھ کر پیار سے بابا جان کہتے تھے۔ بہر حال دُرانی باباؒ خود فرمایا کرتے تھے ۔ کہ میرے مُرشد نے بھی مجھے خود خلافت عطا نہیں کی اور نہ ہی میں کسی کو ایسا منصب سونپ سکتا ہوں۔ البتہ جو بھی خدمتِ خلق میں آگے بڑھے گا۔ خدا عزوجل اس کو خود ہی اعلی' مقام اور درجہ عنایت کریگا۔
دُرانی باباؒ کی گدی پر آجکل بظاہر اُن کے بھتیجے اور داماد پروفیسر پاشا متمکن ہیں ۔ جو بنیادی طور پر انکی طرح انجنیٔر ہیں۔ اور ریٹائیٔرڈ ہیں۔ حیات آباد فیز ۵ کے ایک بنگلے میں دُرانی بابا کی طرح ہفتہ وار ہومیو پیتھک علاج کرتے ہیں اور دوائیاں بانٹتے ہیں ۔ ہفتے میں ایک روز معتقد سامعین دُرانی باباؒ کے ریکارڈ شدہ صوفیانہ مسایٔل پر بحث توجہ سے سُنتے ہیں اور فیض اُٹھاتے ہین۔ شام نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد محفل برخواست ہوجاتی ہے ۔

''

باب چہارم

پیر مغاں یا سنگِ پارس

(حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی نوراللہ مرقدہ)

بہت روئیں گے کرکے یاد اہلِ میکدہ تجھکو
شراب دردِ دِل پی کر تمہارے جام و مینا سے
(شاعر سے معذرت کیساتھ)

ایک ایسی متنوع الصفات ہستی جنہوں نے یونیورسٹی ۔ پشاور شہر ۔ صوبہ پختونخوا اور یہاں تک کہ ملحقہ صوبہ پنجاب کی سرزمین کو اپنے فیض سے بقعۂ نور اور خاکِ کیمیا بنادیا۔ وہ مکتبِ سلیمانی سے فیضیاب حضرت مولانا محمد اشرف قدس سرہ' تعالی' کی مقناطیسی روحانی شخصیت تھیں۔
یونیورسٹی کے ہر کونے پر ذکرِالٰہی کیلئے مساجد تعمیر ہوئیں، اِس روحانی' دینی اور اِصلاحی انقلاب کی برکت تھی کہ نوجوان اُستادوں اور شاگردوں کے چہرے سُنتِ رسولﷺ کے اِتباع میں شرعی داڑھیوں سے مُزین اور منور ہوگئے۔ اکثر ہاتھوں میں تسبیح کے دانوں اور زبانوں پر کلماتِ پاک کے وِرد کیساتھ گھومنے لگے ۔ جسم کے لباس میں ٹائ اور کسی ہوئ تنگ پینٹ کی جگہ لمبی آستینوں کی قمیصوں اور پانچے چڑھائے چوڑی دار شلواروں نے لے لی۔ جیبوں میں مِسواک نظر آنے لگی۔ تبلیغی اِجتماعات۔ سہ روزوں ۔ چِلوں اور شبِ جمعہ کی رونقیں بڑنے لگیں۔ اندروں اور بیرونِ ملک تبلیغی جماعتیں۔ وعظ اور اخلاق سازی کیلئے گشت پر نکلنے لگیں۔ رمضان مبارک کے بابرکت مہینے میں ہر سو راتوں کو جگہ جگہ قال اللہ اور قال الرسول کی روحانی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ علاقہ پشاور میں اِن روحانی بہاروں اور روحانی مناظر کا سارا کریڈٹ صرف اور صرف مولانا محم اشرف سلیمانیؒ اور اُن کے بیشمار پُرجوش اور فنا فی التحریک تبلیغ ساتھیوں کو جاتا ہے ۔ ۔

تعارف:

حضرت محمد اشرف صاحب کا تعلق پٹھانوں کے مہمند قبیلے سے تھا۔ والد مرحوم کا اسمَ گرامی محمد اکبر خان تھا۔ پشاور کے قریب شیخ محمدی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مرحوم اسلامی شعاہر کے پابند ایک فقیر منش ۔ صاحبِتقوی' اور مہمان نواز شخصیت تھیں۔ اپنا قالینوں کا کاروبار دہلی۔ کلکتہ ۔

دارجیلنگ اور شِملہ تک محیط تھا۔ والدہ صاحبہ کا وطن بھی تپہ خلیل مہمند شیخ محمدی پشاور تھا۔ نیک فطرت اور پاکباز خاتون تھیں۔ مولانا صاحب چھ مئ ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوۓ۔ جاۓ پیدائش محلہ مقرب پشاور شہر تھا۔ ان کے تین اور بھائ بھی تھے۔ بڑے بھائ محمد اکرم خان ائر فورس میں اسکورڈن لیڈ ر رہے۔ اور بعد میں فارن سروس میں تریڈ کمشنررہے ۔ دوسرے بھائ محمد اسلم خان فوج کے شعبہ صحت سے بطور ائر وائس مارشل ریٹائر ہوۓ۔ راقم الحروف کے ڈائرکٹر اور سیکرٹری ہیلتھ بھی رہے۔

تعلیم و ملازمت: مولانا موصوف کا گھریلو ماحول ابتداء ہی سے علمی اور دینی تھا۔ والد محترم سے فارسی اور اُردو کی دینی کُتب پڑھیں۔ فارسی ادب کا ذوق پایا۔ والدہ صاحبہ سے ناظرہ قرآن پڑھا۔ لیکن خود فرماتے تھے کہ باوجود عربی کے اُستاد ہونے کے ابتک ان کی قرأت اور تجویدِ قرآن صحیح نہیں ہے۔ اور ایسا ہونا والدہ کی شاگردگی اور اولین طرزِ ادائیگیٔ الفاظِ قرآنی کا اثر ہے۔ گھر میں ہی ایک خالہ زاد بھائ سے الگ متعد د اُردواور فارسی کی متداول تفاسیر۔ احادیث۔ سیرت اور فقہ کی کُتب پڑھیں۔

ابتدائ سکول کی تعلیم اسلامیہ سکول شملہ سے حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں میٹرک کا اِمتحان اسلامیہ ہائ سکول نمبر ۲ پشاور سے اِمتیازی حثیت سے پاس کیا۔ اگلے سال۱۹۴۱ ء میں ادب فاضل کی سند پنچاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اسی دانش گاہ سے ایف۔ اے اور بی۔ اے کیا۔ حضرت سلیمان ندویؒ کے مشورے پر پشاور یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے(عربی) کی ڈگری اعلی' اعزاز کیساتھ پائ۔ دو سال بعد پنچاب یونیورسٹی سے پرائویٹ اُمیدوار کے طور پر ایم۔ اے (فارسی) کی ڈ گری بھی حاصل کرلی۔ دینی تعلیم اپنے ہی محلے کی مسجد کے پیش امام حضرت نور الاسلام باجوڑی سے حاصل کی۔

شادی:

۱۹۷۵ء میں مازرہ شبقدر کے مولانا سید فقیراللہ شاہ صاحب کی دُختر نیک اختر کے ساتھ شادی کی۔ موصوفہ مہمانوں اور متعلقین کی اچھی خدمت کرتیں اور ماۂ رمضان میں معتکفین کا خوب خیال رکھتیں تھیں۔ البتہ اولاد کی نعمت سے محروم تھیں ۔

معمولات:

اپنے مکان پر عصر سے مغرب عام مجلس ہوا کرتی تھی۔ مولانا صاحب درسِ کلامِ پاک کیساتھ ساتھ وعظ و نصیحت فرماتے۔ حاضرین کے سوالات کے جواب دیتے۔ البتہ بروز جمعہ قرآن،پاک کا ختم ہوتا اور پھر اِجتماعی دُعا پر محفل اختتام پذیر ہوتی۔

لباس و خوراک:

مولانا صاحب عام لباس شلوار قمیص ۔ قراقلی ٹوپی اور شیروانی زیبِ تن فرماتے۔ اور موسم کے مطابق لباس و پوشاک استعمال فرماتے۔

مولانا کھانا کم تناول فرماتے۔ کھبی کھبی پاۓ اور حلیم کھانا بھی پسند فرماتے۔ کھانے کے بعد سبز چاۓ ضرور نوش فرماتے۔ تہجد اور اشراق کے نوافل کی ادائیگی روز کا معمول تھا۔ فجر کی نماز

کے بعد خطوط کے جوابات ضرور خود یا کسی معتقد سے لکھواتے۔ اشراق کے بعد قیلولہ بھی روز کے معمولات میں شامل تھا۔

بیماریاں: مولانا صاحب کو کئ بیماریاں اور عوارض درپیش تھیں۔ ۱۹۵۲ء میں عمر کے ساتھ بڑھتی ہوئ پٹھوں کی شکست و ریخت کی لاعلاج بیماری سے واسطہ پڑا۔ جس کی وجہ سے سماعت ۔ بصارت اور گویائ متاثر ہوگئ۔ چلنے پھرنے سے آہستہ آہستہ محروم ہوتے گئے۔ معدے کی تیزابیت یعنی السر(زخم) عمر بھر کا دردِ سر رہا۔ خود فرماتے تھے ۔"ساری عمر قسما قسم بیماریوں کا شکار رہا۔ بدنی کمزوری۔ السر۔ دمہ اور الرجی وغیرہ ۔ سماعت۔ د ید اور گویائ سب متاثر۔ لیکن طاقتِ زبان کسی حد تک اب بھی سلامت ہے۔ پروردِگار تیرا شکر ۔ عنایت اور کرم ہے۔ جب تک زندہ ھوں' اِسی سے تیرے دین کی خدمت جان و دِل سے اِنشاء اللہ کرتا رہونگا" ۔

ملازمت: مولانا مرحوم نے ۱۹۵۴ء میں اِسلامیہ کالج میں بطور جونئیر لیکچرر چارج سنبھالا۔ ۱۹۷۸ء میں عربی ڈیپارٹمنٹ کے چیرمین مقررہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں ملازمت سے ریٹائرہوئے۔ بعد میں دو سال تک ملازمت میں توسیع کی گئ۔

رھائش: سروس کے اوائل میں اسلامیہ کالج کے مکان نمبر ۱۰ میں رہائش پذیر رہے۔ بعد میں مکان نمبر ۱۴ میں منتقل ہوئے اور آخر میں ایک بڑے بنگلے ۱۷۔ اے میں تشریف لے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے مکان اشرف منزل ۔ شائین کالونی بالمقابل اسلامیہ کالج میں آباد ہوئے۔

سیاسی زندگی: مولانا صاحب نے قیامِ پاکستان اور اس کے قیام کے چند سال بعد تک مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قوم کی خدمت کی۔ مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل ر ہے۔ مسلم لیگ کے خُفیہ وِنگ کو بھی چلایا۔ گھر پر پارٹی کے پیغام کی تشہیر کیلئے ایک ریڈیو سٹیشن قائم کیا۔ لیکن پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ ۱۹۵۳ء میں سیاست سے دِل مکمل طور پر بیزار ہوگیا اور تمام تر توجہ تبلیغ و اشاعت دین پر دینی شروع کی۔

سلاسل طریقت: وہ چاروں سلاسلِ طریقت سے منسلک تھے۔ ان کے اولین پیر و مُرشد سید سلیمان ندویؒ تھے اُنکی وفات کے بعد شیخ عبدالعزیز دعاجوؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت فرمائ اور انکی رحلت کے بعد مہمند ایجنسی کے حضرت مولانا فقیر محمدؒ سے تعلق جوڑا۔ اور اُن سے مزید فیض پایا۔

خلفاء: حضرت مولانا اشرف سلیمانیؒ کے ۲۵ خلفاء تھے ۔ ان میں مولانا احمد جان غزنی خیل جیسے بیباک اور خوش بیان عالم و مقرر بھی شامل تھے۔

اسفار و حج: ۱۹۵۵ء میں سفرِ ہند کیا۔ ۱۹۵۷ء میں کئ بیرونِ ملک تبلیغی سفر کئے ۔ اور اپنے تاثرات اور کوائف کو تحریری شکل دِی۔ اور زندگی بھرمیں نو(۹) حج ادا کئے۔

اخلاق و معاملات: مولانا صاحب کی طبیعت میں تواضع۔ جود و سخا، دیانت ۔ صبر ۔ برداشت ۔ مرّوت ۔ عزم و استقامت ۔ شجاعت اور طنز و مزاح کی خوبیاں۔ اوصاف اور اخلاقیات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئ تھیں ۔ مستجاب الدعا بزرگ تھے۔ عشقِ رسولﷺ میں سراپا ڈوبے ہوئے تھے ۔ جنات بھی آپ کے قابو میں تھے۔ اِس لحاظ سے جِنی پیر بھی کہلائے جاسکتے ہیں ۔

مسئلکی تنگ نظری اور علمی تعصب: ایک مبلغ اور کامل صوفی ہونے کے وجہ سے روایتا" تو مولانا صاحب کو مسئلکی مسائِل میں وسیع الخیال اور بالغ النظر ہونا چاہئِیے تھا ۔ لیکن افسوس ان پر دیو بندی اشرفی مکتبِ فکر کے سخت تقلیدی نظریات عمر بڑھنے کیسا تھ ساتھ فزود تر ہوتے گئے۔ مثلا" مشہور عالم اور مفسرِقرآن سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریروں کو ایمان شکن کہا۔ ایک دوسرے اھم مبلغِ اسلام اور مفسر ڈاکٹر اِسرار مرحوم کو بار بار اُن کے تقاضے کے باوجود وقت نہ دینا ۔ نامور شیعہ عالم عارف الحسینی مرحوم کے لئے دعائے مغفرت سے یہ کہہ کر انکار کرنا کہ وہ صحیح مسئلک پر نہیں تھے ۔ اِسی طرح بوہرہ فرقے کے پیشوا اور اِمام سید بُرہان الدین کو مروجہ ملکی اور بین الاقوامی لقب "سید نا" کی بجائے "سیّدُ ھم" کہہ کر پُکارنا ۔ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مزار پر پھولوں کی چادر پھیلانے اور خواجہ کے وسیلے سے ربِ کائِنات سے دعائیں مانگنے کی صد یوں پُرانی روایت سے صاف اِنکار کرنا چند مثالیں ہیں۔ اور ایسے اقدامات اتحادِ اُمت و مود تِ بین المسلمین کی دعوت کے بھی خلاف تھے۔ بہر حال بزرگوں کی اپنی ایک شان ِ طریق اور عاد ت ہوتی ہے اور یہ راز مردِ بزرگ ہم سے بہتر سمجھتے ہیں ۔

اِسکی نفرت بھی عمیق'اِس کی محبت بھی عمیق

قہربھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پر شفیق

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں

ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

دینی معرکے: حضرت مولانا قدس سرہ' نے اپنی زندگی میں کئ دینی معرکے سر کیئے **۔ و**ہ وفاقی شرعی عدالت کے جج اور مجلسِ شوری' (وفاقی پارلیمنٹ) کے ممبر رہے۔ پشاور یونیورسٹی میں قادیانی سازشوں کا ڈ ٹ کر مقابلہ کیا۔ مُنکرینِ حدیث کو جُھٹلایا اور بے نقاب کیا۔ پشاور صدر میں فری میسن لاج کی وسیع و عریض زمین پر مسجدِ درویش اور مدرسہ امداد العلوم حکومتی رکاوٹوں کے باوجود تعمیر کیے۔ وفاقی شرعی عدالت اور مجلسِ شوری' میں شاتمِ رسولﷺ اور رِجم کی شرعی حد پر مُدلل بحثیں فرمائیں۔

تصانیف:

(۱) سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر۔ اشاعت ۔ مکتبِ سرمدی ۔ ۱۹۶۹ء

(۲) سلوکِ سلیمانی یا شاہراہِ معرفت ۔ تین جلد ۔ شائع ۱۹۸۱ء

(۳) فضائِل اعمال کا فارسی ترجمہ

(۴) اکابرین علماء اور اولیاء پر شاہکار مضامین

(۵) اصلاحی خطبات (دو جلد یں)

(٦) شاتم رسولﷺ کی شرعی سزا

(۷) قرآن و حدیث کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے تقاضے

(۸) آنحضرتﷺ کے داعیانہ اخلاق۔

اس کے علاوہ کئ کتابچے اور مقالات ان کے قلم گوہربارسے معرض تحریر میں آئے اور چھپتے رہے۔ غیر مطبوعہ مواد ڈھیر سارا موجود ہے۔

اولاد: مولانا لاولد تھے-البتہ انکی والدہ صاحبہ۔ انکی دو بہنیں اور انکی ایک بھانجی انکے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔

اخری آرام گاہ:

یونیورسٹی کے عمومی قبرسان میں اپنی والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ مرحومہ کے ساتھ آپکی

آخری آرام گاہ ہے۔ یہ جگہ کافی عرصہ قبل انجنیٔرنگ کالج پشاورکے سابق پرنسپل عبیداللہ دُرانی صاحب نے اپنے لیے مخصوص کراکر یہاں ایک قُبہ بنوایا۔ جس کو یونیورسٹی طلباء نے مسمار کردیا تھا۔ اور کافی کھلی جگہ درمیان میں خالی پڑی تھی۔ قبر کے سرہانے کتبے پر لکھی ہوئ تحریریوں درج ہے۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم فقل سلامُ علیکم۔ کتب ربکم علی' نفسہ الرحمتہ و رحمتی وسعت کُل شی۔
حضرت مولانا محمد اشرف السلیمانی رحمہ اللہ الودود

پیدائش: ٦مئ ۱۹۲۵ء بروز جمعرات ۔ وفات: ۱۹ ستمبر۱۹۹۵ء بروز منگل

آنکہ بخشیدہ ہمیشہ مردہ دِل را زندگی ۔ کوچ کرد از دارِمحنت خوش بہ نعمت خانہ شد

(ترجمہ: وہ ہستی جو ہمیشہ مُردہ دِ لوں میں جان ڈالا کرتی تھی۔ اِس غم اور مصیبت کے گھرکو چھوڑ کر(دائمی) نعمت کدہ کی طرف چلی گئ۔)

<u>مولانا محمد اشرفؒ کے بارے میں میرے ذاتی تاثرات اور مشاہدات</u>

مولانا اشرف صاحب کو میں نے پہلی بار اغلبا" ۱۹۶۱۔ ۶۲ء کے دوران ان کی رہائش گاہ پر دیکھا۔ میرے بڑے بھائ الطاف حسین شاہ کے ان کے ساتھ معتقدانہ اور نیازمندانہ تعلقات تھے۔ عصر کے وقت ہم دونوں وہاں پہنچے۔ ایک خوش شکل' شگفتہ خو اورہنس مُکھ درمیانی عمر کے ایک بزرگ سامنے گھٹنوں کے بل تشریف فرما تھے۔ گرد ایک دائرے کی شکل میں چند دیگر نوجوان بھی مؤدبانہ سر جھکائے نیٹھے ہوئے تھے۔ برادرم صاحب نے احتراما" دو زانو ہوکر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ میں نے ان کے اِس فعل کی تقلید کی۔ خیال رہے کہ مولانا بزرگوار جسمانی طور پرخاصے معذور تھے اور کانوں کیساتھ سُننے کیلئے آلہ سماعت بھی لگا رکھا تھا۔ اس پہلی نورانی محفل کی تفصیل تو مجھے یاد نہیں۔ صرف اِتنا یاد ہے کہ مولاناؒ پہلے آہستہ آہستہ دھیمے انداز میں اپنی گفتگو شروع کرتے۔ بعد میں ان کی آواز بلند ہوجاتی اور فصاحت و بلاغت کے دریا بہانا شروع کردیتے۔ درمیان میں کبھی کبھی اردو و فارسی کے اشعار بھی اپنے بیان میں پرودیتے۔ کلامِ اقبال کے تو گویا حافظ تھے۔ ایک بات یہ بھی میرے مشاہدے میں آئ کہ اس دوران اگر جلال اور شانِ کبریائ کا ذ کرآتا یا حضورﷺ کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا کوئ قصہ آجاتا یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔ اولیاءِعظام کی قربانیوں اور دینی حمیّت کا تذکرہ آجاتا تو سنجیدہ ماحول کے گھمبیر سناٹے مین اچانک ان کی زبان سے بے ساختہ "اللہُ" کا نعرہ مستانہ نکل جاتا۔ ان کی اس ادا کی ہیبت اور گونج ایسی لاشعوری ہوتی کہ مجھ جیسا کمزور اعصاب بندہ ڈر کے مارے کانپ جاتا۔ اور ایسے سامع مجلس کی غیر اِرادی جنبش و حرکت مولانا مرحوم کے ہونٹوں پر ایک دلبرانہ مسکراہٹ طاری کردیتی۔

ہمارے محترم بھائ جان بچپن سے ہی نماز۔ روزہ اور دیگر فرائضِ د ینی کے بڑے پا بند ہیں۔ اخلاقِ عالیہ۔ شرافت اور خاموش طبیعت کے مالک ہیں۔ مُصلے' ان کے لیۓ تختِ شاہی سے بڑھ کر ہے ۔ ان کی ابتدائ دینی اور روحانی تربیت میں همارے نانا جان مرحوم سید زمان شاہؒ ۔ بنوں کے حافظ شیر جان اور حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ اپنی سوانح حیات" حدیث نامہ بر" میں مولانا اشرف نوراللہ مرقدہ' کی شخصیت۔ محبت اور فیض کا ذکر یوں کرتے ہیں۔"محمد اشرف صاحب اسلامیہ کالج میں عربی کے اُستاد تھےٗ ہماری فارسی اختیاری کے استاد جب کبھی چھٹی پر ہوتے تو اشرف صاحب ہماری کلاس کو بھی پڑھا لیتے۔ ان کے فصاحت اور بلاغت کے تو ہم اس دن سے معتقد ہوئے جب کالج کے ڈین ساحب ریٹائر ہوگئے اور ایک دن مولانا اشرف صاحب کی مبلغانہ تقریر ہم نے سُنی۔ وہ بِلا شُبہ ایک عظیم انسان اور جیّد عالم تھے۔ ہمارے دوست ظفربیگ بیٹھنی کی تجویز پر ہم چند دوستوں نے مولانا صاحب سے قرآنِ پاک کا درس لینے کا فیصلہ کیا۔ جس کیلیے انہوں نے حامی بھر لی۔ ظفربیگ جو ایک ذہین و فطین مگر متلاطم شخصیت کا مالک تھا' نے خود تو محض چند روز تک ہمارا ساتھ دیا۔ لیکن میں اور فتح محمد کافی عرصے تک مولانا صاحب کے حلقۂ درس اور صحبتِ صالحہ سے فیض یاب ہوتے رہے۔ اُن ہی کے دولت کدہ پر ہمیں کئ اکابرین سے ملنے اور اُن کی عالمانہ گفتگو سُننے کا اِتفاق ہوا ۔اِن ہی میں مشہور صاحبِ تصنیف و تالیف مولانا امین الدین اِصلاحی اور تبلیغی جماعت کے حاجی عبد الحمید(ڈائریکٹر جنرل ٹیلی فون و تیلی گراف) اور حاجی ارشد صاحب شامل تھے۔ یہ عقدہ تو کافی بعد مہں ہم پر کھلا کہ مولانا اشرف

صاحب تو تحریکِ پاکستان سے بطورسالار پاکستان مسلم لیگ نیشنل گارڈ ز اور مولانا الیاسؒ صاحب کی تبلیغی جماعت سے بحثیت ایک عظیم مبلغ کے وابستہ رہے ہیں۔ اُن ہی دنوں ہندوستان سے مولانا الیاس ؒ کے بیٹے اور جانشین مولانا محمد یوسف صاحب پاکستان آئے۔ اُن سے ملنے اور اُنکے مواعظِ حسنہ پشاور کی تاریخی مسجد مہابت خان میں سُننے کا موقعہ ملا اور بعد ازاں مولانا اشرف کی قیادت میں رائے وِنڈ میں بین الاقوامی اِجتماع میں شریک ہوئے۔ مولانا صاحب عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی اور پیر بھی تھے۔ اور صوفیاء کے چاروں سلسلوں سے بیعت تھے۔ ان کی ان متنوع حثیتوں کے متعلق بھی دلچسپ بحث ہوتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے ہماری معلومات میں اِضافہ فرماتے۔ ان کا دولت کدہ مرجع خلاًق تھا۔ لیکن ہمارے درس کے اوقات بالکل جُدا تھے۔ بعد میں حج پر جانے اور پھر طویل علالت کی وجہ سے ہم مزید اُن کی صحبت سے مُستفید نہ ہوسکے۔

ہمارے ریاضی کے اُستاد اِفتخار حسین خٹک مولانا صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ لیکن دونوں کے مشاغل اور دلچسپیوں میں بُعد المشرقین تھا۔ افتخار صاحب اچھے ریاضی دان ہونے کے علاوہ شعر و شاعری اور فنونِ لطیفہ سے بھی شغف رکھتے تھے۔ لیکن دونوں پڑوسیوں کا ایک دوسرے کیلئے باہم احترام کا رشتہ ضرب المثال تھا"

اِن کے اس بیان کی تصد یق "تذکرہ و سوانح حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ" کے مُصنیفین و مؤلفین نے بھی حرف بہ حرف کی ہے۔ اب میں حضرت مولانا صاحب کے چند واقعات اور اِرشادات اپنی پشتو تصنیف "دَ اُستادانو لعل او کُتی لعل" (اساتذہ کے فرمودات' سُچے اور جعلی موتی) سے اُردو ترجمہ کرکے پیش کرتا ہوں۔ جس میں علم و حکمت ۔ وعظ و نصیحت اور علم و معرفت اور طنز و مزاح کے کئ نکتے پوشیدہ ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا محمد اشرف اسلامیہ کالج میں عربی کے اُستاد اور تبلیغی جماعت کے امیر تھے۔ ہر شام اِن کے ڈیرے پرایک تبلیغی محفل منعقد ہوتی تھی۔ مختلف الخیال بزرگ پروفیسراور جوان طالب علم شریکِ محفل ہوتے۔ کبھی کبھی مولانا صاحب سے سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا۔ مولانا صاحب ایک مُتقی اور دیندار شخصیت ہونے کے باوجود ایک ہنس مُکھ ۔ شائِستہ مزاج اور حسِ مزاح کے مالک انسان بھی تھے۔ ایک روز انگریزی ادب کے استاد عبد الصمد صاحب انسان کے ارتقائ نظریے کی وکالت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کے سرورق پربندروں اور چیمپینزیز کی تصویریں تھیں۔ صمد صاحب نے کتاب کا سرورق مولانا ساحب کو دکھا کر کہا "مولانا یہ ہمارے آباء واجداد ہیں"۔ مولانا صاحب نے مُسکرا کر فرمایا" کسی کے ہونگے۔ ہمارے تو نہیں"۔ نوجوان لڑکے اِس چُبتے ہوئے فقرے میں چُھپے طنز کو بوجھ گئے اور زور سے ہنسے۔ صمد صاحب اِس بات کا بُرا مان گئے اور زرا غصے سے مولانا صاحب کو مخاطب ہوئے"آپ نے بھی تو اپنے گِرد بندر اکھٹے کر رکھے ہیں(بندروں کا تماشا لگا رکھا ہے)۔

۲۔ جیسے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ میرے برادرِبزرگ الطاف حسین شاہ بھی مولانا صاحب کے معتقدین اور نیازمندوں میں تھے۔ لیکن ساتھ ہی اِن تعلقات میں بے تکلفانہ رنگ بھی شامل ہوجاتا۔ ایک دفعہ مولانا صاحب کے پڑوس میں اُنکا سابقہ گھر ایک مشہور شاعر اور اُستاد کو الاٹ ہوا۔ جو شراب و شباب کا شغل فرمانے کیلیے مشہور تھے۔ ایک شام مولانا صاحب کالج انتظامیہ کی اس ستم ظریفی کا گلہ کرنے لگے تو فرمایا" جس مکان میں صبح شام قال اللہ و قال الرسول کی بابرکت محفلیں جمتی

تھیں وہاں سے اب قلقلِ مینا اور جام و ساغر کے کھڑکنے کی آوازیں آتی ہیں"۔ بھائ جان جو اِن کے پہلو میں بیٹھے ہوۓ تھے' نے فی الفوراِس اُردو مصرعے کی گرہ لگادی: "مسجد کے زیرِسایہ خرابات چاہیں"۔ مولانا بصد کوشش اپنی مُسکراہٹ نہ روک سکے۔

۳۔ ہمارے یہ بھائ جان چند مہینوں تک کیڈٹ کالج میں اُستاد رہے۔ ایک روز مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوۓ۔ مولانا صاحب کی وعظ و نصیحت کا اپنا ایک اندازتھا۔ اپنے مُربیّانہ شفقت کے اس مبلغانہ انداز میں اِستفتار فرمایا"الطاف آجکل کیا کام کرتے ہو؟"۔ بھائ صاحب نے جواب دیا۔ "حضرت کیڈٹ کالج میں اُستاد ہوں۔" مولانا صاحب نے فرمایا" یہ اُستادیاں مستادیاں کرتے رہو۔"۔ اب اِس سے پہلے کہ مولانا صاحب اپنے مخصوص انداز میں پند و نصیحت کیلیے تمہید باندھتے' بھائ جان نے ُپیش بندی کا یہ وار کیا۔ اور قدرے فد ویانہ خفگی ۔ شکایت اور شوخی کے انداز میں کہا:
"حضرت خدا را ب گالیاں تو نہ دیں"۔ مولانا صاحب اپنی زبان سے نکلےاردو محاورے کی نزاکت کو جان گۓ ۔ قدرے زور سے ہنسے اور فرمایا "الطاف۔ تم تو کبھی ہم اہلِ زبان کو بھی مات دے جاتے ہو۔"۔ یاد رہے کہ مولانا صاحب اصل میں تو مہمند پشتون تھے لیکن کافی عرصہ دہلی ۔ شِملہ اور آگرہ میں سکونت پذیرہونے کی وجہ سے اُن کی مادری زبان اُردو تھی۔ اور استادیاں مستادیاں کرنا ایک اردو محاورہ ہے۔ جو زیادہ چالبازیوں اور مکر و فریب کے قبیح معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ ۱۹٦۰ اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں سوشلزم کا نظریہ نئ نسل میں خاصا مقبول تھا۔ ترقی پسند طالب علموں نے اپنی جیبوں پر ایسے تمغے(بیجیز) ٹانکے ہوتے تھے۔ جِن پر ماؤزے تنگ کی شبیہ کندہ ہوتی تھی اور ساتھ ہی چیرمین ماؤ کے اقوال پر مشتمل "ریڈ بُک" پھیراتے نظر آتے۔ جواب میں جمعیتِ طلباء والوں نے "اللہ اکبر" کے تکمے نکالے۔ مولانا صاحب نوجوان نسل میں سوشلزم اور لادینیّت کے اس سیلاب سے دلگیر اور افسردہ تھے۔ کبھی کبھی یہ بھی فرماتے کہ "ہماری نوجوان نسل کو کیا ہوگیا ہے۔ ہر وقت موذی کی ٹانگیں لٹکاۓ پھرتے ہیں"۔

۵۔ مہربان سکول کے دنوں سے میرا دوست اور ہم جماعت تھا۔ ان دنوں انجنیئرنگ کالج میں زیرِتعلیم تھا۔ مولانا صاحب کے تذکرہ و سوانح نگار مؤلفین نے بھی انکا ذکر کیا ہے۔ مولانا صاحب کے بڑے قریب تھے۔ اللہ پاک کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا تعلق اسلامی جمعیت طلباء کے صدر ڈاکٹر کمال آف مرغزکے ساتھ جُڑھ گیا۔ اور اِس وجہ سے مولانا صاحب سے دوریاں پیدا ہوگئیں۔ جب کافی دن غائب رہا تو کسی نے جاکر مولانا صاحب کو خبرکردی کہ مہربان دامن چُڑا کر کسی اور کا ہوگیا ہے۔ تب جناب مولانا صاحب نے اِس دلخراش خبر پر یوں تبصرہ فرمایا " ہاں! یہ جماعت اسلامی والے ہم سے تیار نوالے چھین لیتے ہیں"۔

٦۔ یہ کائنات حادث ہے یا قدیم؟ اِس میں پیش آنے والے واقعات کاتبِ تقدیر کے ہاتھوں سے ازل سے لکھی ہوئ تحریریں ہیں۔ یا پھر یہ اچانک وقوع پزیر ہونے والے مادی حواد ث ہیں؟ یہ فلسفہ کے پُرانے سوالات ہیں۔ ّمولانا صاحب فرماتے تھے"جسے تم حادثہ کہتے ہو' وہ میرے مولیٰ' کی سوچی سمجھی سکیم ہوتی ہے" ۔ کبھی کبھی مولانا صاحب روحانی وارفتگی کے عالم میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک خلیفہ عزیز الحسن مجذوب کا ظاہری اور باطنی سنگار کردہ اور مُزّین یہ عارفانہ شعر باربار پڑھتے اور اِس طرح مجازی اور حقیقی عاشقوں کے دِلوں کے زخموں پر مرحم رکھتے جاتے:

ہر تمنا دِل سے رُخصت ہوگئ --- اب تو آجا اب تو خِلوت ہوگئ

۷۔ ایک روز میں نے اِن سے درخواست کی"حضرت ۔ سلوک میں جب تک اِجازت عطا نہ ہو' بندہ ناقو ہی ہوتا ہے۔ آپ مجھے بیعت فرمالیں ۔ فرمایا"بیعت تو نہیں دے سکتا۔ فی الحال وظیفہ بتا دیتا ہوں"۔ اور اللہ تعالیٰ' کے صفاتی ناموں مین سے ایک کلمہ کا وِرد کرنے کی تاکید فرمائ۔ اسی موقع پرانہوں نے ساتھ ہی فرمایا " الطاف(میرے براد رِ ِ بُزرگ) کی طرح تم بھی ہمیں بھول جاؤگے"۔ اور شومئ قسمت سے وہی ہوا۔ جو حضرت نے فرمایا تھا۔ اُن کی مجالس میں جانے کا سلسلہ کم ہوتا گیا۔ اور آج جب حضرت کی شخصیت اور فیض پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ تو یہ واقعہ بھی حسرتا" بمعِ اِس شعر کے یاد آگیا:

ہے کس قدر عجیب محبت کا سلسلہ ۔ بنتا رہا' بگڑتا رہا' ٹوٹتا رہا

۸۔ ایک بار میری ناف کے نیچے ایک پھوڑا نکل آیا۔ دوائیوں سے علاج کرتا رہا ۔ "لیکن درد بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی"۔ درد کی شدت اِتنی بڑھ گئ کہ میں یونیورسٹی کی سڑکوں پر نیم بیخود گھومتا رہا ۔ بے خیالی میں میرا رُخ مولانا صاحب کے آستانے کی طرف ہوگیا۔ مولانا صاحب تشریف فرما تھے۔ شدتِ درد سے بے تکلفا" اپنا سر انکی گود میں رکھ د یا۔ اور تقریبا" روتے اور چیختے ہوئے اپنی تکلیف بیان کی۔ مولانا صاحب نے ایک ہاتھ سے مجھے سنبھالا اور دوسرا ہاتھ دُکھتے ہوئے پھوڑے پر رکھا اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ میں اِس نیم بے ہوش غنودگی کی حالت سے اِس وقت نکلا جب مولانا صاحب کی یہ مدُھر بھری آواز میری کانوں سے ٹھکرائ "بیٹا کچھ آفاقہ ہوا؟"۔ میں نے "جی" کہہ کر سر ہلایا۔ صبح پھوڑا پَک چُکا تھا۔ اور بستر میں زہر بکھرا پڑا تھا۔ آج اِتنے بڑے پھوڑے کا نشان تک باقی نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے چیخ و پکار اور ذہنی پریشانی کو دیکھ کر ایک بار مولانا صاحب نے فرمایا۔ " بیٹا۔ اب آپ کے علاج کیلیۓ ہمیں ذہنی اور نفسیاتی امراض کا ہسپتال کھولنا پڑے گا"۔

۹۔ انسانی زندگی میں آلام اور آزمائِش کے دور آتے رہتے ہیں۔ لیکن سالک کیلۓ ایسے امتحانات عروجِ روحانی کا باعث بنتے ہیں۔ مولانا صاحب تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہونے کیساتھ ساتھ ایک بلند مرتبت صوفی بزرگ بھی تھے۔ بعض دوستوں کا خیال تھاکہ تبلیغ ایک تحریک ہے اور تصوف میں شیخ اور سلسلہ طریقت جویاۓ حق میں شخصیت پرستی کا رحجان پیدا کردیتا ہے۔ اور اس شخصیت اور مُرشد پرستی کی رو میں بہہ کر مخلص بندہ تحریک کے اصل مقاصد سے دور پڑ جاتا ہے۔ وہ اکثر تحریک کو توجہ دینے کے بجاۓ شیخ سے عقیدت اور مرشد کے آستانے سے اِستفادے کو زیادہ تر جیح دیتا ہے۔ ۱۹۷۷ء کے لگ بھگ اِنھی اِختلافات اور غلط فھمیوں نے پہلے ایک سازش اور بعد میں بُہتان کی شکل اختیار کی۔ نتیجتا" اِس فتنے نے مولانا صاحب کے حساس قلب پر دائِمی ضرب لگانے کے ساتھ مقامی تبلیغی کام کو کافی نقصان پہنچایا۔ ان کے پاک دامن پر بھی چھینٹے پڑے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اِن اِ لزامات کے پیچھے ان ہی کے ایک پُرانے رفیقِ کار کا ہاتھ تھا۔ جنہوں نے آخرمیں مولانا صاحب سے معافی مانگ لی۔ لیکن اِس الزام تراشی۔ فتنے اور بہتان کا ذکرو اثر تا دیرقائِم رہا۔ اِن کا ایک معتقد ہونے کی وجہ سے راقم الحروف کو بھی کافی صدمہ پہنچا۔ اور اِس کے اثرات کے تحت کچھ عرصہ بعد میں نے "تصوف اور جنس" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جو پشاور یونیورسٹی کے ماہنامہ "پشتو" کے جنوری ۱۹۸۳ء کے شمارے میں چھپا۔ اور میری تصنیف "انوارِ چراغ" مطبوعہ ۱۹۹۱ء میں بھی موجود ہے۔

۱۰۔ ایک دفعہ حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ سے اپنے مطالعہ کیلئے ایک زود فہم اچھی اُردو تفسیرِ قرآن کے با بت میں نے دریافت کیا۔ میرا خیال تھاکہ وہ مولانا مودودی صاحب کی تفسیرِ قرآن "تفہیم القرآن" کا نام لیں گے۔ جو نسلِ نو کے اذہان کو زیادہ اپیل کرنے کی شہرت رکھتی ہے۔ لیکن اُنہوں نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور تفسیر "بیان القرآن" کا ذکر کیا۔ اور فرمایا کہ یہ اُردو کی احسن التفاسیر ہے۔ یہ تفسیر چونکہ میری نظر سے گذر چکی تھی۔ اور سچّی بات یہ ہے کہ اِس انمول تفسیرکی ترتیب زبان۔ تفسیری باریکیاں۔ علمی نکات اور ذہنی اِشکالات کی سمجھ میری ذہنی اِستعداد سے باہر تھی۔ اس سے میرے خیال میں مُستند علماءِ کرام اور فضلاء بہتر مستفید ہوسکتے ہیں۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا "حضرت وہ تو میرے لیئے یونانی ہے۔ البتہ اُن کے مواعظ و ملفوظات کی کتابوں اور"بہشتی زیور" کو میں نے شوق سے پڑھا ہے"۔ میری اِن بے تُکی اور شاید جاہلانہ باتوں کو سُن کر بہ ظاہر تو اُن کے لبوں پر مسکراہٹ آئ مگر ان کی اندرونی حیرت اور کرب کو میں نے اُسی وقت محسوس کرلیا۔

۱۱۔ جیسے کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ مولانا صاحب نے جوان عمری سے ہی ملک کی جنگِ آزادی اور سیاسی جد و جہد میں حصہ لیا۔ وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار تھے۔ اور احتجاجی جلسے جلوسوں میں شُدومد سے آگے آگے رہے۔ ڈاکٹر فدا صاحب جو اُن کے نامور خلیفہ اور جانشین ہیں' سے ایک ادبی محفل میں مولانا صاحب کی بابت سُنا کہ ایک بار پشاور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھا۔ پولیس نے ایک باڑلگا کر ایک مقام سے آگے بڑھنے سے روکا۔ سب سے پہلے جس شخصیت نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگا کر ممنوعہ حد کو پار کیا' وہ امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف تھے اور دوسرے سرے پر پر شدید فائرنگ کی بارش میں حضرت مولانااشرف صاحب میدان میں کود پڑے اورآگے بڑھتے چلے گئے۔

۱۲۔ جہانتک مجھے یاد پڑتا ہے یا بھائ جان سے سُنا ہے۔ کہ علامہ پرویز اپنی اوائِلِ زندگی میں دِ لی میں حضرت مولانا کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اُن دنوں پرویز صاحب نے چند دینی مسائِل پر ایک بے ضرر سا کتابچہ لکھا اور سب ساتھیوں کیساتھ مولانا صاحب بھی خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ اِنکے ایک دوست نے ایسی قلمی ہمت کی ہے۔ افسوس! غلام احمد پرویز صاحب بعد میں اجتہاد ۔ تحقیق اور تنقید کے زُعم میں اتنے بے راہ ہوگئےؒ کہ مُنکرِحد یث ٹہرے۔ انکی کتاب "لُغات القرآن " کے بارے میں حضرت مولانا صاحب نے بعد میں صاف لکھ دیا۔ کہ یہ تحریف و تاویلِ فاسدہ کا پلندہ ۔ لغت نویسی سے مذاق اور تلمیح و دجل کا مرکب اور پرویزی حیلہ گری کا نمونہ ہے۔

۱۳۔ قاد یانی اور مرزائ فتنوں کے شدید مخالف تھے۔ انٹی احمدی تحریک کے دوران اِس جماعت کی مکمل بیخ کنی کیلیئے نوجوانوں کو انتھک جد وجہد کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ بطورِمثال وہ تحریکِ آ زادی کے دوران اپنی خفیہ کاروائیوں اور چھاپہ مار سرگرمیوں کا اکثر زکر فرماتے۔

۱۳۔ مولانا صاحب اگرچہ عربی زبان اور ادب کے اُستادِ کامل تھے اور مشہور عالمِ دین تھے۔ لیکن قرآنِ پاک ناظرہ بچوں کو کسی قادری سے پڑھوانےکی تاکید کرتے۔ خود فرماتے تھےکہ بچپن میں قرآنِ پاک اپنی والدہ محترمہ سے پڑھا ہے۔ اِس لئے قرآنی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں کرسکتا۔ واللہ اعلم۔

۱۵۔ ۱۹٦۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ایک رات میں نے اپنے دوست مہربان کیساتھ مولانا صاحب کے آستانے پر گزاری۔ کسی معتقد نے امرود کی ایک پیٹی تحفتا" مولانا صاحب کی نذ ر کی

تھی۔ میں اور مہربان عصر سے یہی امرود کھاتے رہے۔ میں نے مہربان سے مزاحا" کہا۔" مہربان یار تم نے تو یہی امرود نوشِ جان کرنے کیلئے مولانا صاحب کے ہاں ڈ یرہ لگایا ہے"۔ سحری کے وقت تہجد کیساتھ قنوطِ نازلہ پڑھی۔ امام صاحب نے جوش میں آکر "جیوش الکُفر" کی جگہ "جیوشُ الہند" پڑھ کراِجتہاد سے کام لیا۔ نماز پڑھ کر کسی نے کہا کہ امام نے قرآنِ پاک اور احادیث سے باہر کے الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ ہماری نماز نہیں ہوئ۔ مولانا صاحب کامل عالم ہونے کے باوجود فتوی' د ینے سے گریز کرتے تھے۔ دو لڑکے پڑوس میں مولانا عبدالقدوس سرہ' جو جماعتِ اسلامی کے سابقہ امیر قاضی حسین احمد کے بڑے بھائ ۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور شعبہ دینیات کے چیرمین تھے' کے ہاں مسئلہ پوچھنے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے فتوی' دیا کہ نماز دوبارہ پڑھی جائے۔

١٦۔ مولانا صاحب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ایک دن میں اُنکی زیارت پر گیا۔ دیکھا کہ مزار کے احاطے میں ایک ملنگ بیٹھا تھا۔ میں نے نادانی میں یہ سمجھا کہ شاید شُکرانے اور نزرانے بٹورنے کیلئے کسی مجاور نے یہاں قبضہ جما لیا ہے۔ جو ہمارے بزرگوں کے مزارات پر ایک عام رواج ہے۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا"آخر آپ لوگوں نے بھی وہی کاروبار شروع کردیا' جِن بِدعات کے خلاف مولانا صاحب جد وجہد فرماتے رہے"۔ ساتھ ہی پچاس روپے کا ایک نوٹ اِس کو دینے کیلیئے آگے کردیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس ملنگ' جو زبان سے توتلا اور مجذوب تھا' نے زور سے سر ہلایا اور جھٹک کر نوٹ لینے سے سراسر اِنکار کردیا۔ ساتھ ہی کہا کہ "اِس علاقے میں تین غوث گذرے ہیں۔ ایک یہ ھیں(اور قبر کی طرف اشارہ کیا۔)' دوسرے کا نام میں بھول گیا ہوں اور تیسرے کوئ اور ہیں"۔ میں نے اُن کی بُلندئ درجات کی دُعا مانگی اور دِل میں یہ شعر پڑھتا ہوا وہاں سے رُخصت ہوا:

کیمیای است عجب بندگئ پیرمغاں ۔ خاک او گشتم و چند یں درجاتم دادند

(ترجمہ: میرے مُرشد کے پاس ایک نایاب اکثیر ہے۔ اُن کی قدم بوسی کی تو میرے کئ درجات بلند ہوگئے)۔

''

کُتب حوالہ جات ۔

۱۔ تذکرہ و سوانح حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ۔

تصنیف و تالیف:

ڈاکٹر میر حاتم ' ڈاکٹرشیر حسن' ڈاکٹرسراج سواتی

۲۔ دودِ چراغ ۔ مصنف ڈاکٹر چراغ حسین شاہ

۳۔ نالیدلے بلا(پشتو) ۔ ایضا"

۴۔ کُلیاتِ اقبال

۵۔ مسدسِ حالی

٦۔ حیاتِ قادر ۔ عبید اللہ دُرانیؒ

۷۔ وِدر اِی سادھو۔ ایضا"

۸۔ دی ایوالوشن آف فیتھ ۔ ایضا"

۹۔ چار اِسلام ۔ ایضا"

۱۰۔ حدیثِ نامہ بر ۔ مصنف سید الطاف حسین شاہ

۱۱۔ سلوکِ سلیمانی ۔ مصنف مولانا محمد اشرف سلیمانیؒ

۱۲۔ وِکی پیڈیا ڈاٹ کام

''